1



رجالِ قرآن

وہ مردانِ حق جن کے بارے میں قرآن کریم نازل ہوا

دار السلام
DARUSSALAM

ڈاکٹر عبدالرحمٰن عمیرہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد آپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیہ ☆

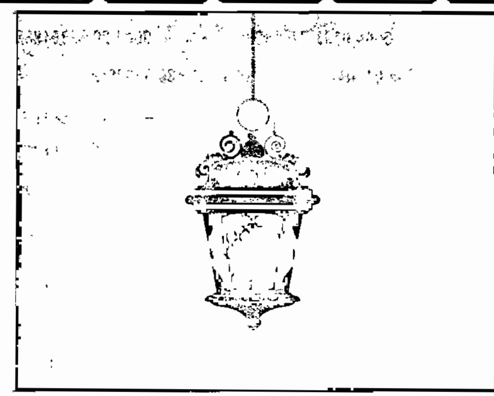
- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com



رجالِ قرآن

وہ مردانِ حق جن کے بارے میں قرآن کریم نازل ہوا

دارُالسّلام
کتاب وسنّت کی اشاعت کا عالمی ادارہ

DARUSSALAM

ⓒ مكتبة دارالسلام، ١٤٣٤ هـ
فهرسة مكتبة الملك فهد الوطنية أثناء النشر
عميرة، عبدالرحمن
رجال انزل الله فيهم قرانا / عبدالرحمن عميرة - الرياض، ١٤٣٤ هـ
٣ مج. ص:٢٥٢ مقاس:١٤×٢١ سم
ردمك:٩-٢٦٣-٥٠٠-٦٠٣-٩٧٨ (مجموعة)
٦-٢٦٤-٥٠٠-٦٠٣-٩٧٨ (ج ١) (النص باللغة الاردية)
١- الصحابة والتابعون ٢- القرآن - اسباب النزول ٣_ السيرة النبوية أ.العنوان
ديوي ٢٣٩,٩ ١٤٣٤/١٠٩١٦ رقم الإيداع: ١٤٣٤/١٠٩١٦
ردمك:٩-٢٦٣-٥٠٠-٦٠٣-٩٧٨ (مجموعة)
٦-٢٦٤-٥٠٠-٦٠٣-٩٧٨ (ج ١)

سعودی عرب ہیڈ آفس

پرنس عبدالعزیز بن جلاوی سٹریٹ پوسٹ بکس:22743 الرّیاض:11416 سعودی عرب
فون: 00966 1 4043432-4033962 فیکس:4021659 www.darussalamksa.com
Email: darussalam@awalnet.net.sa info@darussalamksa.com

الرّیاض ● العلیا۔فون: 00966 1 4614483 فیکس: 4644945 ● الملز فون: 00966 1 4735220 فیکس: 4735221
● سویدی فون: 00966 1 4286641 ● سویلم فون/فیکس: 00966 1 2860422
جدّہ فون: 00966 2 6879254 فیکس: 6336270 مدینہ منورہ فون: 00966 4 8234446,8230038 فیکس: 04 8151121
الخُبر فون: 00966 3 8692900 فیکس: 00966 3 8691551 خمیس مشیط فون/فیکس: 00966 7 2207055
ینبع البحر فون: 0500887341 فیکس: 8691551 قصیم (بریدہ) فون: 0503417156 فیکس: 00966 6 3696124

امریکہ ● نیویارک فون: 001 718 625 5925 ● ہوسٹن: 001 713 722 0419 کینیڈا ● نصیرالدین الخطاب فون: 001 416 4186619
لندن ● دارالسلام انٹرنیشنل پبلیکیشنز لمیٹڈ فون: 0044 20 77252246-0044 20 85394885 ● دارکمہ انٹرنیشنل: 0044 0121 7739309
متحدہ عرب امارات ● شارجہ فون: 00971 6 5632623 فیکس: 5632624 فرانس فون: 0033 01 480 52928 فیکس: 0033 01 480 52997
انڈیا ● دارالسلام انڈیا فون: 0091 44 45566249 موبائل: 0091 98841 12041 ● اسلامک بکس انٹرنیشنل فون: 0091 22 2373 4180
● ہدی بک ڈسٹری بیوٹرز فون: 0091 40 2451 4892 موبائل: 0091 98493 30850 ● ایم/ایس براک انٹرپرائزز فون: 0091 44 42157847
سری لنکا ● دارالکتاب فون: 0094 115 358712 ● دارالایمان ٹرسٹ فون: 0094 114 2669197

پاکستان ہیڈ آفس و مرکزی شوروم

لاہور 36-لوئر مال سیکرٹریٹ سٹاپ، لاہور فون: 00 4 32 372,24 400 372,34 240 373 42 0092 فیکس: 042 373 540 72
● غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور فون: 0092 42 371 200 54 فیکس: 042 373 207 03
● Y بلاک، گول کمرشل مارکیٹ، دکان:2 (گراؤنڈ فلور) ڈیفنس، لاہور فون: 0092 42 356 926 10

کراچی مین طارق روڈ، ڈالمن مال سے (بہادر آباد کی طرف) دوسری گلی، کراچی فون: 0092 21 343 939 36 فیکس: 0092 21 343 939 37

اسلام آباد F-8 مرکز، ایوب مارکیٹ، شاہ ویز سنٹر: 0092 51 22 815 13

info@darussalampk.com | www.darussalampk.com

1

رجالِ قرآن

وہ مردانِ حق جن کے بارے میں قرآن کریم نازل ہوا

ڈاکٹر عبدالرحمٰن عمیرہ

اردو قالب: حافظ قمر حسن

دارالسلام
DARUSSALAM

بسم اللہ الرحمن الرحیم

١٤٢٠

اللہ کے نام سے (شروع) جو نہایت مہربان، بہت رحم کرنے والا ہے۔

فہرست

عرض ناشر

یہ جون 2012ء کی بات ہے کہ راقم الحروف ریاض کے مشہور اشاعتی ادارے داراللواء للنشر والتوزیع کے شوروم میں گیا۔ مجھے ایک کتاب کی تلاش تھی جو میرے علم کے مطابق اسی ادارے سے ملتی تھی۔ مطلوبہ کتاب ملی یا نہ ملی یہ مجھے اب یاد نہیں مگر مجھے اس ادارے کی شائع شدہ کتاب ''رجال أنزل اللّٰهُ فیهم قرآنا'' نظر آ گئی۔ میں کسی زمانے میں اس کتاب کو جستہ جستہ دیکھ چکا تھا۔

میں اس بات پر اللہ کا شکر گزار ہوں کہ مجھے اللہ اور اس کے رسول ﷺ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اسلامی تاریخ سے محبت ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ میری ذاتی لائبریری میں تاریخ سے متعلق بہت ساری کتابیں ہیں۔ اگر ہم اسلامی تاریخ کی بات کریں تو اس کا کوئی صفحہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ذکر سے خالی نہیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا نام آتے ہی وہ سنہرا دور آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے جب اللہ کے رسول ﷺ کے زیر تربیت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو راضی کرنے کے لیے اپنی زندگیاں دین پر فدا کر گئے تھے۔ صحابہ کرام نے جس طرح اللہ اور اس کے محبوب ﷺ کی اطاعت اور فرمانبرداری کی اور اس کے لیے قربانیاں دیں تاریخ ان کی مثال دینے سے قاصر ہے۔ صحابہ کرام ان اوقات کی تلاش میں رہتے تھے

کہ کب انھیں وقت ملے اور وہ اللہ کے رسول ﷺ کو راضی کریں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بعض ایسی خوش قسمت شخصیات بھی تھیں کہ جن کے افعال اور اعمال کا تذکرہ اللہ رب العزت کو اتنا پسند آیا کہ ان کا ذکر قرآن کریم میں کر دیا۔

قرآن کریم بلاشبہ دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ دنیا کا کونسا ایسا ملک ہوگا جس میں مسلمان نہ بستے ہوں؟ اور جہاں مسلمان ہوں گے وہاں قرآن ہوگا اور قرآن کریم میں ان صحابہ کرام کا تذکرہ ہوگا جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنی مقدس کتاب میں کیا ہے۔

آج کے اس پرفتن دور میں جبکہ نوجوان نسل بتدریج اسلام سے دور ہو رہی ہے، اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ہم اپنے نوجوانوں کو اپنے اسلاف کی سیرت پڑھائیں، وہ اسے سنیں اور جانیں کہ ان کی زندگیاں کیسی تھیں، ان کے اخلاق و کردار کیسے تھے اور انھوں نے اسلام کے لیے کتنی قربانیاں پیش کیں۔

میں دار اللواء سے باہر نکلا تو میرے ہاتھ میں ''رجال أنزلَ اللّٰهُ فيهم قرآناً'' کا 7 جلدوں پر مشتمل مکمل سیٹ تھا۔ میں نے اسے جستہ جستہ پڑھا۔ یہ تو نہیں کہوں گا کہ تمام جلدیں پڑھیں مگر مجھے اس کتاب کے فاضل مؤلف ڈاکٹر عبدالرحمٰن عمیرہ کا اسلوب بیان بڑا عمدہ لگا۔ انھوں نے بالکل کہانی کے انداز میں ان صحابہ کرام کی سیرت اس کتاب میں بیان کی ہے جن کے بارے میں قرآن کریم میں آیات نازل ہوئی ہیں۔ انھوں نے اس کتاب میں صحابہ کرام ہی نہیں بلکہ ان کفار کے بارے میں بھی پوری تفصیل کے ساتھ لکھا ہے جن کے بارے میں قرآن نازل ہوا۔

کتاب میں موجود واقعات تاریخ کی مستند کتابوں سے نقل کیے گئے ہیں، ممکن ہے کہ مجھے اور ہمارے قارئین کو ان کی بعض باتوں اور بعض واقعات سے اختلاف ہو مگر بہرحال ان واقعات اور صحابہ کرام کی مبارک زندگیوں میں ہمارے لیے دروس ہیں۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن عمیرہ

نے قلم اٹھایا تو اچھے اور برے لوگوں کی قلمی تصویریں کھینچ دیں۔ ذرا ان تصویروں پر نظر ڈالیے کہ صحابہ کرام کی تصاویر اتنی دلربا ہیں کہ انھیں دیکھ کر انسان نیکی کا متوالا بن جاتا ہے۔

یوں تو تمام کفار نے اللہ اور رسول ﷺ کی مخالفت کی اور اسلام کے خلاف ریشہ دوانیوں میں ملوث رہے اور اسلام کے خلاف سازشیں کرتے رہے مگر کتنے ہی کافر اور منافق ایسے بھی تھے کہ جن کا کام ہی یہ تھا کہ وہ ہروقت اسلام کے خلاف منصوبہ بندی کرتے رہتے۔ ایسے کافروں اور منافقوں کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں آیات نازل کیں۔ فاضل مؤلّف نے سلسلۂ کتاب میں ان کافروں اور منافقین کے بارے میں بھی تفصیل سے لکھا ہے کہ انھوں نے کیا اور کیسی سازشیں کیں اور اللہ تعالیٰ نے کیسے قرآن کریم میں ان کی سازشوں کو بے نقاب کیا۔

بلاشبہ ان واقعات میں امت مسلمہ کے لیے بطور خاص اور انسانیت کے لیے بالعموم کتنے ہی دروس اور عبرتیں ہیں۔

دارالسلام نے اپنے اصول کے مطابق اس کتاب کے پبلشر دار اللواء کے ساتھ ترجمہ کے حقوق کی بات کی۔ اور ایک خطیر رقم کے عوض ہم اس کتاب کے مختلف زبانوں میں ترجمے کے حقوق حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

مجھے امید ہے کہ ہمارے قارئین کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سیرت کا یہ نیا اسلوب پسند آئے گا۔ اس ضمن میں وہ قرآن مجید کے بہت سے اسباب نزول سے بھی آگاہ ہوں گے، فہم قرآن کے سلسلے میں بھی انھیں مدد ملے گی اور تاریخ کے گمنام گوشوں سے بھی وہ گزریں گے۔

میں نے پہلے عرض کیا کہ میرے سامنے دارالسلام کی کتب کا انتخاب کرتے وقت زیادہ تر ہماری نوجوان نسل بطور خاص کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلباء اور طالبات ہوتے ہیں۔ ہم اپنی ان کتب میں ان کے لیے یقیناً بہت سا مواد ایسے سادہ اور دلکش

پیرائے میں پیش کرتے ہیں کہ یہ واقعات ان کے دلوں میں اتر جائیں اور ان کی کردار سازی میں مدد کریں۔ اور ان کے لیے یہ کتب راہنما اصول بن جائیں۔

اللہ کے رسول ﷺ کی بعثت کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ آپ ﷺ لوگوں کی تعلیم وتربیت کے ساتھ ساتھ ان کا تزکیۂ نفس کریں۔ میں کئی مرتبہ سوچتا ہوں کہ کتنی زبردست تربیت اور تزکیۂ نفس تھا کہ ایک شخص صبح اسلام قبول کرتا ہے تو شام تک اس میں اسلامی عقیدہ راسخ ہو جاتا ہے، وہ توحید کا علمبردار اور امن کا داعی بن جاتا ہے، اس کی اخلاقی اور روحانی تربیت فوراً ہو جاتی ہے اور وہ معاشرے کا ایک مثالی فرد بن جاتا ہے۔ اسلام کا سرفروش سپاہی اور مجاہد بن جاتا ہے۔

کتابوں کا یہ سلسلہ خواہ وہ صحابہ کرام سے تعلق رکھتا ہو یا کفار مکہ اور منافقین کے احوال سے متعلق ہو، امت مسلمہ کے لیے راہنما اصول مہیا کرتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس سلسلے کو اسکولوں، کالجوں اور حلقۂ دروس سے منسلک احباب اور ائمہ مساجد، خطباء، سیاستدان، تاجر، وکلاء، جج، ادباء اور سول سروس کے ملازمین کے علاوہ عام شہری، خواہ مرد ہوں یا معزز خواتین، خوب پسند کریں گے اور اس سے بھرپور استفادہ کریں گے۔ ان شاء اللّٰہ

اللہ رب العزت سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اس کتاب کے فاضل مؤلف، مترجم، ناشر اور دیگر معاونین کی کوششوں کو قبول فرمائے۔ اس سلسلے کو مقبول عام بنائے اور ہماری نجات کا ذریعہ بنائے۔ آمین ثم آمین۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

محبکم

عبدالمالک مجاہد

مینیجنگ ڈائریکٹر دارالسلام، الریاض، لاہور

فروری 2013ء

ربیع الاول 1434ھ

پیش لفظ

صحابۂ کرام کا عہد زریں بڑے دلچسپ اور سبق آموز واقعات پر مشتمل ہے۔ اُن کی عطر آگیں سیرت اور پاکیزہ زندگی ایمان و عمل کا بہت بڑا سرچشمہ اور منبع نور و ہدایت ہے، جس سے مسلمانوں نے ایمان و یقین کی مشعلیں روشن کی تھیں اور جس کے ایندھن سے آتش دانِ دل کو مدتوں سلگائے رکھا تھا۔

خلفائے راشدین کی قابل فخر تاریخ ایمان و ایقان، صبر و تحمل، بے پناہ شجاعت، ثابت قدمی اور علم و ہنر کے کارہائے نمایاں سے بھرپور ہے۔ ان کا بے مثال عمل و کردار جس کے ثمرات ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور جس کا فیضان آج تک جاری ہے، یہی تھا کہ وہ لوگوں کے معاملے میں خدا ترس واقع ہوئے تھے۔ دنیا کے مال و متاع سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ خشوع و خضوع کے پیکر تھے اور اللہ تعالیٰ سے ان کا تعلق بڑی مستحکم بنیادوں پر استوار تھا۔ اس تعلق کو منقطع کرنا انھیں ایک لمحے کے لیے بھی گوارا نہیں تھا۔

حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر بن خطاب، حضرت عثمان بن عفان اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم یہ چاروں اصحاب خلفائے راشدین کے بلند و بالا لقب سے پہچانے جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو وصیت کی تھی کہ یہ چاروں جس راہ پر قدم

بڑھائیں، تم بھی اُسی راہ کو اختیار کرنا اور انھی کے منہج وفکر کو اپنا نصب العین قرار دینا۔

آپ نے ارشاد فرمایا تھا:

«عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ، تَمَسَّكُوا بِهَا وَعَضُّوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ»

''میری سنت اور میرے خلفاء کی سنت اپنائے رکھنا، جو اصحابِ رشد و ہدایت ہیں۔ اسے مضبوطی سے تھامنا اور ڈاڑھوں سے پکڑ لینا۔''[1]

ایک موقع پر فرمایا:

«إِنِّي لَا أَدْرِي مَا بَقَائِي فِيكُمْ، فَاقْتَدُوا بِالَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِي»

''بے شک میں نہیں جانتا کہ تم میں کب تک رہوں گا، چنانچہ اُن لوگوں کی پیروی کرنا جو میرے بعد ہوں گے۔''

یہ کہہ کر آپ نے ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی طرف اشارہ کیا۔[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چاروں اصحاب کا فرداً فرداً تذکرہ بھی کیا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

«لَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِيلًا لَا تَّخَذْتُ أَبَا بَكْرٍ خَلِيلًا»

''اگر میں کسی کو خلیل (جانی دوست) بنایا کرتا تو ابوبکر کو خلیل (جانی دوست) بناتا۔''[3]

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا:

---

[1] سنن أبي داود، حديث: 4607. [2] جامع الترمذي، حديث: 3663. [3] صحيح مسلم، حديث: 2383 اور دیکھیے صحيح البخاري، حديث: 467.

«يَا ابْنَ الْخَطَّابِ! وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ، مَا لَقِيَكَ الشَّيْطَانُ سَالِكًا فَجًّا قَطُّ إِلَّا سَلَكَ فَجًّا غَيْرَ فَجِّكَ»

''ابن خطاب! اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، شیطان تم سے جس راہ میں بھی چلتے ملے گا، تمھاری راہ چھوڑ کر ہمیشہ دوسری راہ لے گا۔''[1]

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا:

«أَشَدُّ أُمَّتِي حَيَاءً عُثْمَانُ بْنُ عَفَّانَ»

''میری امت میں سب سے زیادہ حیا دار عثمان بن عفان ہے۔''[2]

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

«أَنْتَ مِنِّي بِمَنْزِلَةِ هَارُونَ مِنْ مُوسٰى»

''تمھارا مرتبہ میرے ساتھ وہی ہے جو ہارون (علیہ السلام) کا موسیٰ (علیہ السلام) کے ساتھ تھا۔''[3]

ہمارے اسلاف میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بلند ترین حیثیت کے مالک ہیں۔ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں علم و عمل کے اعتبار سے خلفائے راشدین سرفہرست ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے ان پاکباز ہستیوں کی درخشاں سیرت کا مطالعہ کرتے ہوئے اس کتاب کی تحریر کا آغاز کیا ہے۔ امید ہے کہ خلفائے راشدین اور دیگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی معیت میں ہمارا یہ علمی و تاریخی مطالعہ ان شاء اللہ بڑا مبارک اور خوشگوار ثابت ہوگا۔

آدمی خوش رنگ و خوشنما پھولوں سے سجے باغ میں گھنے درختوں کے سائے تلے

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 3683، وصحيح مسلم، حديث: 2396. [2] صحيح الجامع الصغير، حديث: 1002. [3] صحيح مسلم، حديث: 2404.

چہل قدمی کرے اور باغ کی تازہ، ٹھنڈی اور نرم ہوا کا لطف اٹھائے تو دل کو کیسی خوشی ملتی ہے اور روح کس قدر معطر ہو جاتی ہے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی مثالی سیرت اور ان کے حسنِ فکر کے مطالعے سے ان شاء اللہ ہمارے دل و دماغ کو بھی رہنمائی کی روشنی نصیب ہوگی۔

زیرِ نظر کتاب خلفائے راشدین کے علم و نظر، سیرت و کردار اور ان کے عظیم کارناموں کی روداد ہے۔ اس میں جہاں آپ کو خلفائے راشدین کی پاکیزہ سوانح عمری پڑھنے کو ملے گی وہیں اُن کے نورِ علم کی روشنیاں بھی جگمگاتی نظر آئیں گی۔ یہی نہیں، تجدید ایمان کا موقع بھی میسر آئے گا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں علم نافع عطا کرے، جو علم عطا کیا ہے اس سے بھرپور استفادہ کرنے کی توفیق دے اور ہمارے علم میں اضافہ فرمائے، آمین۔

ABU UMAIMAH OWAIS

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

ABU UMAIMAH OWAIS

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے متعلق قرآن مجید کی ایک آیت

فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۙ قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْۤ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْۤ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ ۚ اِنِّيْ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاِنِّيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ ﴾

''حتی کہ جب وہ پہنچا اپنی جوانی (کی قوتوں) کو اور پہنچا چالیس برس کو، عرض کیا اے میرے رب! مجھے توفیق دے کہ شکر کروں تیری نعمت کا جو تو نے انعام کی مجھ پر اور میرے والدین پر اور (اس کی بھی توفیق دے کہ) عمل کروں نیک جس سے تو راضی ہو اور اصلاح کر میرے لیے میری ذریت کی۔ بلاشبہ میں نے توبہ کی تیری طرف اور بلاشبہ میں مسلمانوں میں سے ہوں۔'' [1]

بعض مفسرینِ قرآن جن میں امام بغوی، امام سیوطی اور امام واحدی رحمہم اللہ شامل ہیں، اُن کا کہنا ہے کہ یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے متعلق نازل ہوئی۔ [2]

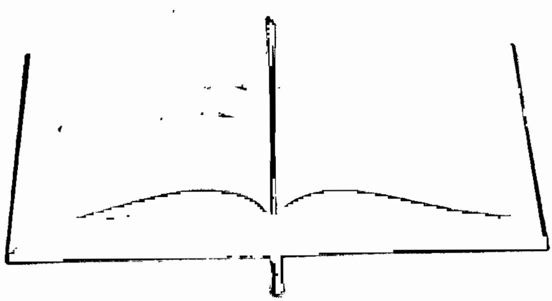
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ہم پر جس کسی کا بھی احسان تھا، اسے ہم نے چکا دیا، سوائے ابوبکر کے۔

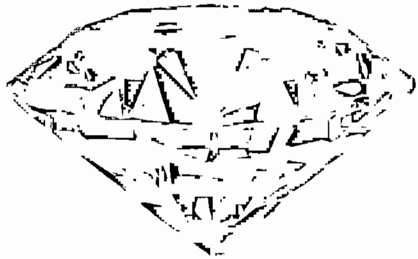
[1] الأحقاف 46:15. [2] دیکھیے تفسیر البغوي: 6/134، والدر المنثور: 6/41، و أسباب نزول القرآن للواحدي، ص:401.

ابوبکر کا ہم پر جو احسان ہے اُسے روز قیامت اللہ تعالیٰ ہی چکائے گا۔ مجھے کسی کے مال سے اتنا فائدہ نہیں پہنچا جتنا فائدہ مجھے ابوبکر کے مال سے پہنچا۔ اگر میں لوگوں میں سے کسی کو خلیل (دلی دوست) بناتا تو بلاشبہ ابوبکر ہی کو دلی دوست بناتا۔ لیکن بات دراصل یہ ہے کہ تمھارا صاحب اللہ کا خلیل (دلی دوست) ہے۔''[1]

میں نے جس کسی کو اسلام کی دعوت دی وہ شش و پنج میں پڑا اور جھجکا سوائے ابوبکر کے۔ انھوں نے میری دعوت بلا تردد قبول کی۔''[2]



[1] جامع الأصول في أحاديث الرسول، حديث:6405. [2] جامع الترمذي، حديث:3661.



حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

مردوں میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سب سے پہلے ایمان لائے۔ آپ ہجرتِ مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیقِ سفر تھے۔ بے کس غلاموں کو سردارانِ قریش کے پنجۂ استبداد سے چھڑاتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفاتِ حسرت آیات کے بعد جب جزیرہ نمائے عرب کے بہت سے افراد مرتد ہوگئے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اُن کے خلاف علَمِ جہاد بلند کیا اور انھیں اسلام کی طرف لا کے چھوڑا۔ وفاتِ نبوی کے بعد مسلمانوں کے پہلے خلیفہ آپ ہی تھے۔ رضی اللہ عنہ

آپ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے والد گرامی ہیں۔ آپ کا نام عبداللہ بن ابی قحافہ اور لقب صدیق ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں عتیق کا لقب دیا۔ اس کے متعلق حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا کہنا ہے کہ ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحاب کرام رضی اللہ عنہم گھر کے آنگن میں تشریف فرما تھے۔ میرے اور اُن کے درمیان پردہ حائل تھا۔ اتنے میں ابوبکر رضی اللہ عنہ تشریف لائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں دیکھا تو فرمایا: ''جو شخص کسی ایسے آدمی کو دیکھنا چاہے جو نارِ جہنم سے محفوظ ہے، وہ انھیں دیکھ لے۔'' [1]

اہل عرب کے ہاں علمِ انساب اور علمِ تاریخ کی بڑی اہمیت تھی۔ انساب میں اُن کی

[1] مسند أبي يعلىٰ :302/8، ومستدرك الحاكم :64/3.

مہارت کا یہ عالم تھا کہ آدمی تو آدمی ہیں، وہ گھوڑوں، اونٹوں تک کے نسب اور خاندانی سلسلے یاد رکھتے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ آپ بھی بہت بڑے ماہر انساب تھے۔ حضرت عقیل بن ابی طالب رضی اللہ عنہ انساب کے مشہور عالم ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اِس فن میں اُن کے بھی استاد تھے۔ آپ کی اس خوبی کے متعلق خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا تھا: ''اہل قریش میں قریش کے انساب کے سب سے بڑے عالم ابوبکر ہیں۔''[1]

اسلام تو اسلام، دور جاہلیت میں بھی اُنھوں نے کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا۔ ایک صاحب نے پوچھا کہ جاہلیت میں آپ نے کبھی بادہ نوشی بھی کی تھی؟ فرمایا: ''اللہ کی پناہ۔'' پوچھا گیا کہ ایسا کیونکر ہوا۔ فرمایا: ''بھئی! میں تو اپنی عزت کو داغدار ہونے سے بچاتا اور اپنی آدمیت کی حفاظت کرتا تھا۔ جو آدمی پیتا ہے وہ عزت تو گنواتا ہی ہے، آدمیت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔''

ان کی یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پتہ چلی تو آپ نے فرمایا:

''ابوبکر نے بالکل درست کہا۔''[2]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جاہلیت میں کبھی بتوں کی پوجا نہیں کی۔ ایک مرتبہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی محفل میں تشریف فرما تھے۔ کسی نے یہ موضوع چھیڑ دیا۔ آپ نے کہا: ''میں نے کبھی کسی بت کو سجدہ نہیں کیا۔ جب میں سن بلوغت کو پہنچا تو ایک روز والد محترم ابوقحافہ نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے بت کدے میں لے گئے۔ مجھ سے کہنے لگے: ''یہ ہیں تمھارے بلند مرتبہ معبود۔''

[1] صحيح مسلم، حديث: 490. [2] تاريخ الخلفاء للسيوطي، ص: 29.

وہ مجھے بت کدے میں اکیلا چھوڑ کر چلے گئے۔ میں ایک بت کے قریب گیا اور کہا: ''میں بھوکا ہوں۔ مجھے کھانا کھلاؤ۔ میرے پاس پہننے کو کچھ نہیں۔ مجھے پہننے کو کپڑے دو۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے ایک بڑا پتھر اٹھایا اور اُسے کھینچ مارا۔ وہ منہ کے بل زمین پر جا رہا۔''[1]

چہرہ مہرہ

سپیدرو، نازک اندام، رخسار ہلکے، کمر قدرے جھکی ہوئی، دبلا پتلا چہرہ، آنکھیں گہری، پیشانی بلند، ہاتھ پاؤں بالوں سے عاری۔''

یہ تھے ہمارے ممدوح جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ۔[2]

اسلام کے زیر سایہ

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بتدریج اسلام کے شناسا ہوئے تھے۔ اُن کا اپنا بیان ہے کہ ایک روز میں کعبہ کے صحن میں بیٹھا تھا۔ زید بن عمرو بن نفیل بھی وہیں تشریف فرما تھے۔ امیہ بن ابی صلت وہاں سے گزرا تو ٹھہر گیا۔ زید کو مخاطب کر کے کہنے لگا: ''خیر کے متلاشی! کہو، کیسے ہو؟''

زید نے جواب دیا کہ خیریت سے ہوں۔

''اور سناؤ، کچھ ملا؟''

''نہیں لیکن میں نے تلاش کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔''

اِس پر امیہ نے کہا: ''روز قیامت تو سارے دین سوائے ایک دین کے جس کا اللہ نے فیصلہ کر رکھا ہے، بے کار ثابت ہوں گے۔ آگاہ رہنا، نبی منتظر یا تو ہمارے قبیلے کا

---

[1] المصباح المضيئ لمحمد بن علی الأنصاري: 38/1. [2] الطبقات الکبریٰ لابن سعد: 188/3.

ہوگا یا پھر تمھارے قبیلے کا۔‘‘

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اِس سے پہلے مجھے معلوم نہیں تھا کہ کوئی نبی آنے والا ہے اور اُس کا انتظار بھی کیا جاتا ہے۔ میں اٹھا اور سیدھا ورقہ بن نوفل کے ہاں پہنچا۔ وہ اکثر آسمان کو گھورا کرتے تھے۔ رنج وغم کے مارے سینے میں دھاڑیں گونجا کرتی تھیں۔ حسن اتفاق سے راستے میں مل گئے۔ شاید کہیں جا رہے تھے۔ میں نے امیہ بن ابی صلت کی بات بتائی تو فرمانے لگے: ’’ہاں، بھتیجے! اہل کتاب اور آسمانی کتابوں کا علم رکھنے والے تو یہی کہتے ہیں کہ نبی منتظر کا تعلق عرب کے سب سے بہتر خاندان سے ہوگا۔ میں عرب کے انساب سے واقف ہوں۔ میرے علم کی حد تک تمھارا خاندان ہی عرب کا سب سے بہتر خاندان ہے۔‘‘

میں نے پوچھا: ’’چچا! نبی کیا فرمائے گا؟‘‘

بولے: ’’نبی وہی فرمائے گا جو اُس پر وحی کیا جائے گا۔ وہ ظلم نہیں کرے گا نہ ظلم کا بدلہ ظلم سے دے گا۔‘‘

چنانچہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو میں آپ پر بے چون و چرا ایمان لے آیا۔‘‘ [1]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مکہ کے باکمال تاجر تھے۔ تجارت کی غرض سے یمن اور شام جایا کرتے تھے۔ تجارت کے سفر سے انھوں نے خاصی دولت کمائی اور مردم شناسی کا جوہر بھی اُن میں پیدا ہوا۔

ایک مرتبہ سفر سے لوٹے تو قریش کا ایک آدمی راستے میں ملا۔ اُس نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا: ’’جی! سنتے ہو! تمھارے صاحب نے کیا کہا۔‘‘

---

[1] تاریخ دمشق الکبیر لابن عساکر:16/23/23.

''کیا کہا انھوں نے!'' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حیران ہو کر پوچھا:

''اُس نے کہا ہے کہ وہ اللہ کا رسول ہے۔''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ یہ سن کر پہلے تو خاموش رہے، پھر فرمایا: ''اگر انھوں نے یہ کہا ہے تو بلاشبہ سچ ہی کہا ہے۔''

سیدھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں پہنچے۔ پوچھا: ''ابوالقاسم! یہ میں کیا سن رہا ہوں؟!''

''کیا سنا ہے آپ نے ابوبکر!؟''

''میں نے سنا ہے کہ آپ توحید الٰہی کی دعوت دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ابوبکر! یہ بات درست ہے۔ میرے رب نے مجھے بشیر ونذیر بنایا ہے۔ اُس نے مجھے تمام لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا ہے۔''

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فوراً کہا: واللہ! میں نے آپ کو کبھی جھوٹ بولتے نہیں دیکھا۔ بلاشبہ آپ رسالت کے مستحق ہیں۔ لائیے، اپنا ہاتھ دیجیے میں آپ کی بیعت کرتا ہوں۔''

یوں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ شرفائے عرب میں وہ پہلے آدمی تھے جو ایمان لائے۔ انھوں نے اسلام کے لیے اپنا دھن دولت، جان و مال سب کچھ پیش کر دیا۔

قبولِ اسلام کے بعد اُنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ دیا کہ ہمیں بیت اللہ میں داخل ہو کر کھلے عام اسلام کی دعوت دینی چاہیے۔ آپ نے اجازت دی تو تمام مسلمان بیت اللہ میں گئے اور اعلانیہ اسلام کی دعوت دے ڈالی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے تقریر کا آغاز کیا تو مشرکین مکہ اُن پر پل پڑے اور زد و کوب کرنے لگے۔ عتبہ بن ابی ربیعہ

نے تو بدتمیزی کی حد کر ڈالی۔ اُس نے اپنا جوتا اتارا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے چہرۂ مبارک پر پے در پے کئی ضربیں لگائیں۔ چہرہ متورم ہو گیا۔ پہچانے نہیں جاتے تھے۔ بنو تیم جو آپ رضی اللہ عنہ کے اہل قبیلہ تھے، انھیں پتہ چلا تو وہ دوڑے آئے۔ مشرکین کو پرے ہٹایا اور آپ کو ایک چادر میں اٹھائے گھر لے آئے۔ چوٹیں ایسی شدید تھیں کہ بنو تیم نے سمجھا آپ زندہ نہیں رہیں گے۔ انھوں نے مسجد میں اعلان کر دیا کہ اگر ابوبکر نے وفات پائی تو ہم عتبہ کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ہوش میں لانے کی کوشش کرتے رہے۔ جب آپ ہوش میں آئے تو سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خیریت دریافت فرمائی۔ قبیلہ والوں نے سخت سست کہا کہ اسی کی وجہ سے اس حال کو پہنچے اور ہوش میں آتے ساتھ ہی اسی کا حال پوچھتے ہو۔ اُن کی والدہ سے کہا کہ اسے کچھ کھلاؤ پلاؤ اور خود چل دیے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نہ کچھ کھاؤں گا نہ پیوں گا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس حال میں ہیں۔ والدہ نے جواب دیا کہ واللہ! مجھے تمھارے صاحب کے بارے میں کچھ علم نہیں۔

فرمایا: ''بنت خطاب کی طرف جائیے۔ اُن سے پوچھ کر آئیے۔''

وہ بنت خطاب کے ہاں گئیں۔ بنت خطاب کو خدشہ ہوا کہ کہیں یہ مشرکین کی جاسوس نہ ہو۔ انھوں نے کہا: ''میں ابوبکر اور محمد بن عبداللہ کو نہیں جانتی۔''

والدہ نے اُن کی منت سماجت کی کہ آپ میرے ساتھ چلیے اور ابوبکر سے خود بات کر لیجیے۔ ان کی حالت بہت نازک ہے۔ وہ تشریف لائیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اس حال میں دیکھا تو دل بھر آیا۔ بولیں: ''جن لوگوں نے تمھارا یہ حال کیا ہے وہ یقیناً بدقماش ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن سے ضرور انتقام لے گا۔''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لبوں پر ایک ہی سوال تھا:

''رسول اللہ ﷺ کا کیا حال ہے؟''

بنت خطاب ابھی تک خائف تھیں۔ بولیں:

''آپ کی والدہ سن رہی ہیں۔'' فرمایا: ''ان کے متعلق بے فکر رہیے۔''

بنت خطاب نے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ صحیح سلامت ہیں۔

آپ نے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ کہاں ہیں، انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ بنت خطاب نے بتایا کہ وہ ارقم بن ابی ارقم کے مکان پر ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ مجھے اُن کی خدمت میں لے چلو۔ میں انھیں دیکھ کر اطمینان کرنا چاہتا ہوں۔

راستے خالی ہوئے اور لوگوں کی آمد و رفت تھمی تو دونوں خواتین حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو سہارا دیے ہوئے روانہ ہوئیں۔ تینوں افراد دارِ ارقم میں داخل ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ نے اُن کی یہ حالت دیکھی تو آپ کو شدید رقت ہوئی۔ [1]

مکہ میں مسلمانوں کا عرصۂ حیات تنگ ہوگیا تو رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو ہجرت حبشہ کی اجازت دی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی رختِ سفر باندھا اور حبشہ کی طرف نکل کھڑے ہوئے۔ راستے میں سیدالقارہ ربیعہ بن فہیم المعروف بہ ابن دغنہ سے ملاقات ہوئی۔ پوچھا: کہاں کا ارادہ ہے۔ فرمایا: حبشہ جاتا ہوں۔ پوچھا: کاہے کو۔ فرمایا: تمھاری قوم نے جینا دوبھر کر دیا۔ ابن دغنہ نے کہا: نہیں ابوبکر! تم جیسے آدمی شہر چھوڑ کر نہیں جایا کرتے نہ انھیں شہر سے نکالا جاتا ہے۔ تم واپس چلو۔ اپنے شہر میں اپنے رب کی عبادت کرو۔ میں تمھیں پناہ دیتا ہوں۔

[1] البداية والنهاية:3/34,33.

مکہ پہنچ کر ابن دغنہ اشراف قریش سے ملا اور انھیں بتایا کہ اُس نے ابوبکر کو پناہ دی ہے۔ اشراف قریش نے اُس کی یہ بات تسلیم کی اور کہا کہ ٹھیک ہے، اس سے کہو، اپنے گھر میں اپنے رب کی عبادت کرے، وہیں نماز پڑھے اور جو چاہے قراءت کرتا رہے لیکن ہمیں ایذا نہ دے اور یہ کام اعلانیہ نہ کرے۔ ہمیں ڈر ہے کہ وہ ہماری عورتوں اور ہمارے بچوں کو خراب کر دے گا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے گھر کے باہر آنگن میں جائے نماز بنائی۔ دن بھر وہیں بیٹھے نماز پڑھتے اور تلاوت کرتے رہتے۔ قریش کے نوجوان، عورتیں اور بچے اُن کے گرد اکٹھے ہو جاتے اور بغور تلاوت سنتے۔ تلاوت اختتام پذیر ہوتی تو وہ لوگ گھروں کو چلے جاتے اور وہی باتیں دہراتے رہتے جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے سن کر جاتے۔ قریش کے سرداروں کو یہ بات کہاں ہضم ہوتی۔ انھوں نے ابن دغنہ سے رابطہ کیا اور کہا کہ ابوبکر کو روکو ورنہ اُسے اپنی پناہ سے نکال دو۔ ابن دغنہ، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاں گیا اور اُن سے کہا کہ یوں کھلے بندوں نماز پڑھنی اور قراءت کرنی چھوڑ دو ورنہ میں اپنی پناہ واپس لیتا ہوں۔

فرمایا: ”تم اپنی پناہ واپس لو۔ مجھے اللہ کی پناہ کافی ہے۔“ [1]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے دعوت دین کا کام جاری رکھا۔ مکہ کے کئی سرداروں نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ ان میں عثمان بن عفان، زبیر بن عوام، طلحہ بن عبیداللہ، سعد بن ابی وقاص، عثمان بن مظعون، ابوعبیدہ بن جراح اور عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہم جیسے نامی گرامی سردار شامل تھے۔ جو سردارانِ قریش مسلمان ہوئے تھے، وہ تو کسی طرح مشرکین مکہ کے قابو میں نہیں آئے، البتہ جو غلام مسلمان ہوئے، ان بیچاروں

[1] صحيح البخاري، حديث: 2297.

پر بڑا ظلم وستم کیا گیا۔ موذنِ رسول حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ جو پہلے پہل غلام تھے، مسلمان ہوئے تو اُن کا آقا انھیں صحرا کی تپتی ریت پر لٹا کر سینے پر بھاری پتھر رکھوا دیتا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ بھاری پتھر تلے دبے ہوئے بھی اَحَد اَحَد (اللہ ایک ہے، اللہ ایک ہے) پکارتے رہتے اور بالآخر بے ہوش ہوجاتے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو پتہ چلا تو آپ نے اُنھیں سونے کی پانچ اشرفیوں کے عوض خریدا اور آزاد کردیا۔ قریش کے ظالم سردار نے کہا کہ تم ایک اشرفی بھی دیتے تو ہم اسے بیچ ڈالتے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ تم سو اشرفی بھی طلب کرتے تو میں اسے خرید کر رہتا۔ [14]

یوں اُنھوں نے کئی مجبور ومقہور غلام، جو مسلمان ہوچکے تھے، خرید خرید کر آزاد کیے۔ مشرکین مکہ نے سوچا کہ یہ تو گھاٹے کا سودا ہے۔ مسلمانوں کی تعداد تو برابر بڑھتی جاتی ہے۔ اسلام کی دعوت بھی بدستور جاری ہے۔ تو انھوں نے چراغِ نبوت گل کرنے کا گھناؤنا منصوبہ بنایا۔ اُدھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اذنِ ہجرت مل گیا۔

رفیق سفر

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بیان کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز دوپہر کے وقت اُن کے گھر تشریف لائے۔ آپ عام طور پر اُس وقت نہیں آیا کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ کو آتے دیکھا تو کہا کہ کوئی خاص بات ہے ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تشریف نہیں لایا کرتے۔

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اندر تشریف لائے۔ کمرے میں حضرت ابوبکر، حضرت اسماء اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ آپ نے تشریف رکھتے ہی فرمایا کہ اہل خانہ

[14] الکامل لابن الأثیر:67,66/2.

کو باہر بھیج دیجیے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! فکر مت کیجیے یہ آپ ہی کا گھر ہے اور یہ میری بیٹیاں ہیں۔ ان کے سامنے آپ جو کہنا چاہیں، کہہ سکتے ہیں۔ اِس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اذنِ ہجرت مل گیا ہے۔''

عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا مجھے ہمراہی کا شرف حاصل ہوگا۔

فرمایا: ہاں۔ آپ بھی میرے ساتھ چلیں گے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ واللہ! اس سے پہلے مجھے نہیں پتہ تھا کہ خوشی کی وجہ سے بھی آنسو نکل پڑتے ہیں۔ اُس روز جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے والد محترم سے یہ فرمایا کہ ہاں، آپ بھی میرے ساتھ چلیں گے تو والد محترم بے اختیار رو دیے۔ تب مجھے پتہ چلا کہ خوشی کی وجہ سے بھی آنسو نکل آیا کرتے ہیں۔

اس کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے نبی! میرے پاس دو سواریاں ہیں جو میں نے اِسی وقت کے لیے تیار کر رکھی تھیں۔

عبداللہ بن اُرَیقط کو راستے کے رہبر کے طور پر ساتھ لیا گیا اور اسے اِس کام کی اجرت دی گئی۔ [1]

یوں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے ہمدمِ دیرینہ کے ہمراہ مدینہ ہجرت کی۔

مدینہ پہنچ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین و انصار کے درمیان مؤاخات کا رشتہ قائم کر دیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا رشتۂ مؤاخات خارجہ بن زید انصاری رضی اللہ عنہ کے ساتھ قائم ہوا۔ آپ نے خارجہ بن زید رضی اللہ عنہ کے ہاں قیام کیا۔ انھوں نے اپنی بیٹی حبیبہ آپ کے عقد میں دے دی۔

[1] صحيح البخاري، حديث:3905.

خارجہ بن زید انصاری رضی اللہ عنہ کا شمار کبار صحابہ میں ہوتا ہے۔ وہ غزوہ احد میں شہید ہوئے۔ انھیں صفوان بن امیہ نے اپنے باپ کے بدلے میں شہید کیا تھا۔ صفوان کے باپ امیہ کو خارجہ اور معاذ بن عفراء رضی اللہ عنہما نے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنی جان، مال اور زندگی اسلام کے لیے وقف کر دی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ اُن کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

''ہم پر جس کسی کا بھی احسان تھا، اُسے ہم نے چکا دیا سوائے ابوبکر کے۔ اُن کا ہم پر جو احسان ہے اُسے روز قیامت اللہ تعالیٰ ہی چکائے گا۔ ابوبکر کے مال سے مجھے جتنا فائدہ پہنچا، اُتنا فائدہ مجھے کسی کے مال سے نہیں پہنچا۔ میں نے جسے بھی اسلام کی دعوت دی اُس نے پس و پیش کیا سوائے ابوبکر کے، ابوبکر نے بلا تردد اسلام کی دعوت قبول کی۔''[1]

ہجرت کے پانچویں برس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو ساتھ لیے مکہ روانہ ہوئے۔ عمرے کا قصد تھا۔ قریش کو خبر ہوگئی کہ آپ مکہ کی طرف آ رہے ہیں۔ انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ آپ کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو سفیر بنا کر مکہ بھیجا تاکہ وہ قریش مکہ کو بتائیں کہ مسلمان جنگ کرنے نہیں آئے۔ وہ تو محض عمرہ کرنے آئے ہیں۔

اس کے باوجود قریش مکہ مُصِر رہے کہ مسلمان مکہ میں نہیں آسکتے۔ فریقین میں مذاکرات ہوئے۔ آخر یہ طے ہوا کہ مسلمان مدینہ لوٹ جائیں اور اگلے برس عمرے کے لیے آئیں۔ صلح نامے کی بعض شرائط وقتی طور پر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی سمجھ

[1] جامع الترمذي، حديث:3661، والسيرة النبوية لابن هشام:90/2.

میں نہیں آئیں۔ انھوں نے سمجھا کہ مسلمانوں کی حق تلفی ہو رہی ہے۔ وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہا:

"ابوبکر! کیا یہ رسول اللہ نہیں؟"

بلاشبہ! رسول اللہ ہیں!" حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔

"یا پھر ہم مسلمان نہیں!"

"کیوں نہیں۔ ہم بھی مسلمان ہی ہیں۔"

"تو پھر یہ لوگ مشرکین نہیں؟"

"نہیں۔ یہ بھی مشرکین ہی ہیں۔" حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے قدرے حیران ہو کر کہا۔

"تو پھر اپنے دین کے معاملے میں ہم سے گھٹیا شرائط کیوں منوائی جاتی ہیں؟"

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "عمر! انھی کے راستے پر چلتے رہو۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔"

اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی کہا: "میں بھی شہادت دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔"[1]

یہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ایمان کامل ہی تھا جس نے اُن سے یہ جواب کہلایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی اسی درجہ ایمانی پر فائز تھے، تاہم وہ پہلے پہل بات سمجھ نہیں پائے۔ اس سلسلے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اُن پر سبقت حاصل تھی۔

ایک مرتبہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ لوگوں میں آپ کو سب سے پیارا کون ہے۔

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 365/3.

فرمایا: ”عائشہ!“

عمرو رضی اللہ عنہ نے کہا: ”میرا مطلب تھا آدمیوں میں سے۔“

فرمایا: ”عائشہ کا والد۔“ [1]

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ کو جو فریضۂ رسالت سونپا تھا وہ آپ نے نہایت ذمہ داری سے سرانجام دیا۔ آپ ﷺ نے وفات پائی تو مسلمان نہایت حیران ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تو یہاں تک کہہ ڈالا:

”کچھ منافق قسم کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ وفات پا گئے ہیں۔ بخدا! رسول اللہ نے وفات نہیں پائی۔ وہ تو موسیٰ بن عمران علیہ السلام کی طرح اپنے رب کے ہاں گئے ہیں۔ وہ ضرور واپس آئیں گے اور اُن لوگوں کے ہاتھ کاٹ ڈالیں گے جو یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ وفات پا گئے ہیں۔ کان کھول کر سن لو! میں نے جسے یہ کہتے سُن لیا کہ رسول اللہ ﷺ وفات پا گئے ہیں، اپنی اِس تلوار سے اس کی گردن اڑا دوں گا۔“ [2]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ باتیں کہہ رہے تھے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تشریف لائے۔ رسول اللہ ﷺ کے جسد اطہر کو چادر سے ڈھانپ کر گھر کے ایک گوشے میں رکھ دیا گیا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے چہرۂ اقدس پر سے چادر کا پلو ہٹایا، مبارک پیشانی پر بوسہ دیا اور کہا: ”فداك أبي و أمي! (میرے ماں باپ آپ پر قربان) آپ زندہ و مردہ دونوں حالتوں میں پاکیزہ ہیں۔ اللہ نے آپ کے لیے جو موت لکھی تھی وہ آپ کو آ گئی۔“ یہ کہہ کر چادر کا پلو دوبارہ چہرۂ اقدس پر ڈال دیا۔

کاشانۂ نبوی سے باہر آئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسی لہجے میں بول رہے تھے۔ انھیں

[1] صحيح البخاري، حديث: 3662. [2] البداية والنهاية لابن كثير: 272/5.

خاموش ہونے کو کہا۔ وہ بولتے رہے۔ آپ نے دیکھا کہ وہ خاموش نہیں ہوتے تو لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور گفتگو کا آغاز کر دیا۔ لوگ بھی خاموشی سے آپ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ آپ نے اللہ کی حمد وثنا بیان کی اور فرمایا:

"لوگو! جو آدمی محمد ﷺ کی عبادت کرتا تھا وہ سن لے کہ محمد ﷺ وفات پا چکے ہیں۔ اور جو آدمی اللہ کی عبادت کرتا ہے وہ جان لے کہ اللہ زندۂ جاوید ہے۔ وہ کبھی وفات نہیں پائے گا۔"

پھر آپ نے یہ آیت قرآنی تلاوت فرمائی:

﴿ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاۡىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۝﴾

"محمد بھی تو رسول ہی ہیں۔ اُن سے پہلے بھی رسول گزرے۔ تو کیا اگر وہ وفات پا جائیں یا مقتول ہوں تو تم اپنی ایڑیوں پر مڑ جاؤ گے؟ اور جو اپنی ایڑیوں پر مڑے گا وہ اللہ کا کچھ نقصان نہیں کرے گا۔ اور اللہ عنقریب شکر کرنے والوں کو جزا دے گا۔"[1]

لوگوں کی یہ حالت تھی کہ گویا پہلی مرتبہ یہ آیت سن رہے ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی گفتگو سن کر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ یقین ہوا کہ رسول اللہ ﷺ واقعی وفات پا چکے ہیں تو وہ غش کھا کر گر پڑے۔[2]

حیاتِ نبوی میں نماز کی امامت

[1] آل عمرٰن 3:144، صحيح البخاري، حديث: 3668. [2] البداية والنهاية لابن كثير: 272/5.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ جب بیمار پڑے تو بلال رضی اللہ عنہ آپ کو نماز کی اطلاع دینے آئے۔ آپ نے فرمایا: ''ابوبکر سے کہو کہ لوگوں کو نماز پڑھا دیں۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے عرض کیا:

''یارسول اللہ! ابوبکر زود رنج آدمی ہیں۔ آپ کی جگہ کھڑے ہوں گے تو مارے غم اور رقت کے تلاوت نہیں کر پائیں گے۔ اگر آپ عمر سے نماز پڑھانے کو کہہ دیں تو بہتر ہو۔''

آپ ﷺ نے فرمایا: ''ابوبکر ہی سے کہو کہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔''

میں نے حفصہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ تم کہو۔ حفصہ رضی اللہ عنہا بھی حاضر خدمت ہوئیں اور وہی بات کہی جو میں نے کہی تھی۔

آپ نے ڈانٹ دیا: ''بلاشبہ تم تو یوسف والیاں ہو۔ ابوبکر ہی سے کہو کہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔''

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ناراض ہو کر کہا:

''تم سے تو مجھے کبھی بھلائی نہ ملی۔''[1]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نماز کا آغاز کیا تو رسول اللہ ﷺ کو قدرے افاقہ معلوم ہوا۔ آپ دو آدمیوں کے سہارے مسجد میں تشریف لائے۔ کمزوری کے مارے پاؤں لٹکے ہوئے تھے اور زمین پر لکیریں کھنچتی آتی تھیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ کی آہٹ پائی تو پیچھے ہٹنے لگے۔ رسول اللہ ﷺ نے اشارہ کیا کہ کھڑے رہیے۔ آپ آگے تشریف لائے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بائیں طرف بیٹھ گئے۔ یوں آپ لوگوں کو بیٹھ کر نماز پڑھاتے رہے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کھڑے ہو کر نماز پڑھاتے رہے۔ حضرت

[1] صحيح البخاري، حديث: 678-683,682.

ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا کرتے اور لوگ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اقتدا کرتے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی کا امامت کے لیے کیوں انتخاب کیا گیا۔ کیا اس لیے کہ وہ آدمیوں میں سب سے پہلے ایمان لائے تھے یا اس لیے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یارِ غار تھے یا پھر اس لیے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی اور آپ کے پیارے تھے؟ ممکن ہے کہ یہ تینوں اسباب بھی ہوں، تاہم بنیادی اسباب یہ نہیں تھے۔

دراصل وفات نبوی کے بعد امت کو جس مشکل مرحلے سے گزرنا اور جس گھمبیر مسئلے کا شکار ہونا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا بخوبی اندازہ تھا۔ آپ بلاشبہ بڑے مردم شناس تھے۔ آپ نے نگاہِ بصیرت سے دیکھ لیا تھا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی اس اہم ذمے داری کو پورا کر سکتے ہیں۔ اس کی تائید حضرت مطعم بن عدی رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی ہوتی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ایک مرتبہ ایک خاتون کسی سلسلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں آئی۔ آپ نے اُس سے فرمایا: ''دوبارہ آنا۔''

اس نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! اگر آپ سے ملاقات نہ ہو سکے تو (مطلب یہ کہ آپ وفات پا جائیں تو) کس سے ملاقات کروں۔

فرمایا: ''تو ابوبکر سے ملنا۔''[1]

معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امور ریاست کی ذمے داری سونپا کرتے اور انھیں اس کا اہل سمجھتے تھے۔ مسلمانوں کی کثیر تعداد کو بھی اُن کے اِس مقام و مرتبے کا احساس تھا۔ تو سوال یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اِس امر کے متعلق کیوں فکر مند تھیں۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ کیوں عرض کیا اور بعد میں حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے بھی کہلوایا کہ ابوبکر (رضی اللہ عنہ) زود رنج آدمی ہیں۔ وہ آپ

[1] الطبقات الكبرٰى لابن سعد: 178/3، ومسند أحمد، حديث: 16813.

کی جگہ کھڑے ہوں گے تو تلاوت نہیں کر پائیں گے۔ آخر اس کی وجہ کیا تھی۔

اس کی وجہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے خود بیان فرمائی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ میرا خیال یہ تھا، جو آدمی وفات نبوی کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مصلے پر کھڑا ہوگا اور آپ کا نائب بنے گا، لوگ اُسے کبھی پسند نہیں کریں گے۔ لوگ اُسے بدفالی کی علامت بنا ڈالیں گے۔ اسی خدشے کے پیش نظر میں یہ چاہتی تھی کہ میرے والد لوگوں کی نفرت کا نشانہ نہ بنیں۔ [1]

---

[1] صحیح مسلم، حدیث: 418.

بیعتِ خلافت

انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں اکٹھے ہوئے۔ مہاجرین کو پتہ چلا تو وہ بھی پہنچ گئے۔ ایک انصاری صحابی حضرت خباب بن منذر رضی اللہ عنہ نے مہاجرین سے کہا کہ ایک امیر ہم میں سے ہوگا اور ایک آپ میں سے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ عرب، قریش کے سوا کسی اور کی حاکمیت تسلیم نہیں کریں گے۔ ہم امیر ہوں گے اور آپ وزیر۔ آپ کی مشاورت کے بغیر کوئی معاملہ طے نہیں پائے گا۔ عمر بن خطاب اور ابوعبیدہ میں سے کسی ایک کی بیعت کر لیجیے۔

اِس پر حضرت عمر اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہما نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی۔ اس کے ساتھ ہی تمام مہاجرین و انصار بیعت کے لیے ٹوٹ پڑے۔ اگلے روز حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مسجد نبوی میں خلیفہ کی حیثیت سے تقریر کی اور منشورِ خلافت پیش کیا۔ حمد و ثنا کے بعد آپ نے فرمایا:

''لوگو! مجھے تمھارا والی بنا دیا گیا ہے حالانکہ میں تم میں سب سے بہتر نہیں ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ قرآن نازل ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی سنتیں اختیار کیں۔ اور ہم نے قرآن وسنت کا بہت سا علم حاصل کیا۔ یہ بات خوب اچھی طرح سمجھ لو کہ نہایت سمجھ داری کی بات تقویٰ ہے جبکہ نہایت احمقانہ بات فسق و فجور ہے۔

یاد رکھو کہ تم میں سے سب سے طاقتور آدمی میرے حساب سے کمزور ہے تا آنکہ میں اس سے وہ معاملہ کروں جس کا وہ مستحق ہے۔ اور تم میں سے کمزور ترین آدمی میرے حساب سے قوی ہے تا آنکہ میں اُس کا بھی حساب برابر کردوں۔

لوگو! میں تو بس پیروکار ہوں (دین کے معاملے میں) کوئی نیا کام میں نہیں کروں گا۔ میں اگر اچھا کروں تو میری مدد کرنا۔ ٹیڑھا ہو جاؤں تو مجھے سیدھا کردینا۔''[1]

اسلام میں جو آدمی لوگوں کا حاکم بنتا ہے وہ انھی کا ایک عام فرد ہوتا ہے۔ اسے حکمرانی کی ذمے داریاں سونپی جاتی ہیں۔ ایک عام فرد کی طرح وہ لوگوں پر اپنی رائے نہیں ٹھونس سکتا نہ اُن سے مشاورت کیے بنا کوئی فیصلہ کرسکتا ہے۔ ریاست کے عام افراد کی طرح اگر وہ اچھے کام کرتا ہے تو اُس کی عزت بڑھتی ہے اور مقام و مرتبہ میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور لوگوں کے دل میں اُس کی محبت جاگزیں ہوتی ہے۔ اسی امر کا اعادہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی صدارتی تقریر میں کیا تھا۔ انھوں نے واضح کیا تھا کہ اُن کا طرز حکومت جن اصولوں پر مبنی ہوگا وہ براہِ راست قرآن و سنت سے ماخوذ ہوں گے۔ وہ ہر حال میں اسلامی تعلیمات کی پیروی کریں گے اور اسی کو اپنا شعار بنائیں گے۔ یوں نہ تو کوئی طاقتور اللہ تعالیٰ کے احکامات کی خلاف ورزی کر پائے گا نہ کسی کمزور کے حقوق پر ڈاکہ ڈالا جاسکے گا۔ شریعت کی نظر میں سب کے سب برابر ہیں - نہ کوئی ادنیٰ ہے نہ کوئی اعلیٰ - کیونکہ سب آدم کے بیٹے ہیں اور آدم مٹی سے پیدا ہوئے تھے۔

خدمتِ خلق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی فطرت کا حصہ تھی۔ اکثر اوقات مدینہ کی بڑی بوڑھی خواتین کی بکریوں کا دودھ دوہ دیتے۔ انھیں آٹا گوندھ دیتے۔ گھر کی صفائی

[1] الطبقات الكبرىٰ لابن سعد:183,182/3، الكامل لابن الأثير:332/2.

ستھرائی کر دیتے۔ خلیفہ بنے تو ایک روز ایک بچی اپنی والدہ سے کہنے لگی: ''اماں! اب بکریوں کا دودھ کون دوہا کرے گا؟'' کسی نے جا کر اُس بچی کی بات حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بتا دی۔ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ فرمایا: ''مجھے میری زندگی کی قسم! میں اب بھی اُن کی بکریوں کا دودھ دوہا کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ جو ذمے داری مجھ پر پڑی ہے اس کے باعث میرے معمولات نہیں بدلیں گے۔'' [1]

یوں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے منصبِ خلافت پر فائز ہونے کے بعد بھی خدمت خلق کا کام جاری رکھا۔

ایک مرتبہ ایک بکری کا دودھ دوہنے لگے تو ایک نوعمر لڑکی جو پاس ہی کھڑی تھی، آپ رضی اللہ عنہ مزاحیہ انداز میں اُس سے کہنے لگے: ''اے لڑکی! بولو، جھاگ بناؤں کہ نہیں!''

وہ لڑکی بولی: ''جھاگ بناؤ۔''

تو وہ دودھ دوہتے ہوئے جھاگ بنانے لگے۔

کبھی وہ لڑکی کہتی کہ جھاگ مت بنانا تو وہ جھاگ نہ بناتے۔ [2]

لشکر اسامہ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

منصبِ خلافت پر فائز ہونے کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو سب سے پہلے جس معاملے سے واسطہ پڑا وہ لشکر اسامہ کی روانگی کا معاملہ تھا۔

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کی سرکردگی میں ایک لشکر ترتیب دیا تھا اور اسے شام کی مہم سونپی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی تو یہ لشکر مدینہ سے تین میل دور پیش قدمی کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ وفات نبوی کی نہایت افسوس ناک خبر پہنچی

[1] الطبقات الکبریٰ لابن سعد: 186/3. [2] کنز العمال: 610/5.

تو اُنھوں نے پیش قدمی کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ بعدازاں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان اِس سلسلے میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ایک فریق کی رائے یہ تھی کہ خود مدینہ پر مرتدین کے حملے کا خطرہ ہے۔ اس صورت میں اتنا بڑا لشکر شام بھیج دیا گیا تو مدینہ شدید عدم تحفظ کا شکار ہو جائے گا۔ اِس فریق میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سرفہرست تھے۔

دوسرا فریق جس میں خود خلیفۂ رسول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے، اس کا موقف یہ تھا کہ حالات جیسے بھی ہوں، لشکر اسامہ کو بہر صورت روانہ کر دینا چاہیے۔

پہلے فریق کا اصرار بڑھا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہہ ڈالا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عَلَم باندھ دیا ہے، بخدا! میں اُسے ہرگز نہیں کھولوں گا۔ جنگلی درندے ہم پر دھاوا کر دیں، تب بھی نہیں۔ [1]

ایک تیسرا فریق بھی تھا جو اِس سے تو متفق تھا کہ لشکر روانہ ہونا چاہیے تاہم اُس کی رائے یہ تھی کہ لشکر کا سپہ سالار نوعمر اسامہ کے بجائے کوئی اور تجربہ کار آدمی ہونا چاہیے۔

خلیفۂ رسول حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا موقف اس سلسلے میں بے حد واضح تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ہر حال میں ارشاد نبوی کی تعمیل کی جائے۔ لشکر شام کی مہم پر ضرور روانہ ہونا چاہیے اور سپہ سالار بھی وہی ہونا چاہیے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منتخب کیا تھا، یعنی حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما۔ انھوں نے اِس کا حتمی فیصلہ کیا تو تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ آپ نے لشکر کو ہدایات جاری کرتے ہوئے فرمایا:

”خیانت مت کرنا۔ دھوکا مت دینا۔ مثلہ (لاشوں کی بے حرمتی) مت کرنا۔ چھوٹے بچے کو، بڑے بوڑھے کو اور عورت کو قتل مت کرنا۔ کھجور کا درخت مت

---

[1] الكامل لابن الأثير:334/2، والبداية والنهاية لابن كثير:343/6.

کاٹنا، نہ اسے جلانا۔ کوئی پھل دار درخت بھی مت کاٹنا۔ کھانے کی ضرورت ہو تو درست ورنہ بکری، گائے اور اونٹ ذبح مت کرنا۔ جلد ہی ایسی قوم کے قریب سے تمھارا گزر ہوگا جو تمھارے پاس برتنوں میں رنگا رنگ کھانے لائیں گے۔ اُن میں سے تم یکے بعد دیگرے جو بھی شے کھانا اللہ کا نام ضرور لے لینا۔ اب اللہ کا نام لے کر روانہ ہو جاؤ۔''[1]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اِس بیش قیمت نصیحت میں بامقصد اور شریفانہ لڑائی کے اصول بتائے۔ آپ نے واضح کیا کہ مسلمان اسلام کے لیے لڑتا ہے نہ کہ محض قتل و غارت کی خاطر۔ جو لوگ لڑائی میں شریک نہیں ہوتے اور مقابلے میں نہیں آتے انھیں قتل کرنے سے بالخصوص منع فرمایا۔ آخر میں فرمایا کہ اُن راہبوں کو بھی مت مارنا جو خانقاہوں کی چار دیواری میں محصور ہیں۔ لشکر روانہ ہوا تو آپ انھیں الوداع کرنے کو پیدل ہی چل پڑے۔ آپ کی سواری حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے پاس تھی۔ وہ بھی ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:

''رسول اللہ کے خلیفہ! بخدا! یا تو آپ سوار ہو جائیے یا میں اتر پڑتا ہوں۔''

فرمایا: ''نہیں۔ واللہ! تم نہیں اترو گے نہ میں سوار ہوں گا۔ راہِ خدا میں میرے قدم بھی ذرا دیر کو خاک آلود ہو جائیں تو کیا حرج ہے۔''

پھر آپ نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اگر تم عمر کو میری معاونت کے لیے یہیں چھوڑ سکو تو ایسا ضرور کرو، چنانچہ اُن کی اجازت سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ، خلیفۂ رسول کے ہمراہ لوٹ آئے۔

[1] الكامل لابن الأثير:335/2، والبداية والنهاية لابن كثير:343/6.

تواضع، عجز و انکسار اور حفظ مراتب کی ایسی عمدہ مثال شاید ہی کہیں مل سکے۔

آخر میں آپ نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمھیں جو حکم دیا تھا اُس کی تعمیل کرنا اور اس سلسلے میں ذرہ بھر کوتاہی مت برتنا۔''[1]

اس وقت جبکہ جیش اسامہ شام کی طرف روانہ ہوا، کئی ذہنوں میں یہ سوال گردش کر رہے ہوں گے کہ کیا خلیفۂ رسول، جیش اسامہ کو ہر صورت روانہ کرنے میں حق بجانب ہیں؟ کیا مدینہ منورہ کی سالمیت واقعی خطرے میں نہیں ہے؟ کئی مسلمانوں کے مشورے کے باوجود خلیفہ رسول نے اپنی ہی رائے پر عمل کیوں کیا؟ یہ اور ایسے کئی سوال اُس وقت ذہنوں میں پیدا ہوئے ہوں گے۔

لیکن جب جیش اسامہ شام کی مہم نہایت کامیابی کے ساتھ سر کرنے کے بعد واپس آیا تو فریق مخالف بھی خلیفۂ رسول کے حکمت بھرے فیصلے کی افادیت تسلیم کیے بغیر نہ رہ سکا۔ جیش اسامہ کی وجہ سے عرب میں مسلمانوں کی دھاک بیٹھ گئی۔ یہ لشکر جہاں جہاں سے گزرا وہاں کے اہل ارتداد سہم گئے۔ جو لوگ بغاوت کے لیے پر تول رہے تھے وہ آرام سے بیٹھ گئے۔ وہ ایک دوسرے سے کہنے لگے: ''مسلمان اگر کمزور ہوتے تو اتنا بڑا لشکر لے کر مدینہ منورہ سے کیونکر نکلتے۔''

جیش اسامہ اگر بالفرض روانہ نہ کیا جاتا تو مدینہ منورہ کی سالمیت کو اور زیادہ خطرات لاحق ہو جاتے۔ تاہم مدینہ منورہ میں یہ خبریں برابر آ رہی تھیں کہ بہت سے مسلمان قبائل مرتد ہو گئے ہیں اور بعض دیگر قبائل نے زکاۃ دینے سے انکار کر دیا ہے۔ اُدھر مسیلمہ کذاب کے فتنے نے بھی سر اٹھایا۔

[1] الكامل لابن الأثير:334/2، البداية والنهاية لابن كثير:244/6.

ارتداد کی لڑائیاں

رسول اللہ ﷺ نے وفات پائی تو عرب کے بہت سے بدو قبائل مرتد ہو گئے۔ مدینہ منورہ میں بھی نفاق پھوٹ پڑا۔ قبائل کے وفود مدینہ منورہ آتے۔ نماز کا تو اقرار کرتے کہ نماز ضرور پڑھیں گے اور زکاۃ کی ادائیگی سے انکار کرتے۔ بعض قبائل نے یہ موقف اختیار کیا کہ وہ خلیفۂ رسول کو زکاۃ نہیں دیں گے۔ بطور دلیل وہ قرآن مجید کی یہ آیت پڑھتے:

﴿ خُذْ مِنْ اَمْوٰلِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ﴾

”اُن کے اموال سے زکاۃ لے کہ تو اُن کو پاک کرے اس سے اور اُن کا تزکیہ کرے اور دعا دے اُن کو۔ بے شبہ تیری دعا اُن کے لیے باعث اطمینان ہے۔“[1]

اُن کا کہنا تھا کہ ہم تو اُسی کو زکاۃ دیں گے جس کی دعا ہمارے لیے باعث اطمینان ہے۔ بعض نے اِس معاملے میں شعر وشاعری بھی کی تھی۔ ایک شاعر نے کہا تھا:

أَطَعْنَا رَسُولَ اللّٰهِ إِذْ كَانَ بَيْنَنَا
فَوَا عَجَبًا مَا بَالُ مُلْكِ أَبِي بَكْرٍ

”رسول اللہ جب تک ہمارے درمیان تھے، ہم نے اُن کا کہا مانا۔ لیکن اب تو ابوبکر کی حکومت ہے۔ مقام حیرت ہے کہ ہم ابوبکر کی بات مانیں! وہ جانے اور اُس کی بادشاہت۔“

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے خلیفۂ رسول کو مشورہ دیا کہ مانعین زکاۃ کو اُن کے حال پر چھوڑ

[1] التوبۃ 103:9.

دیجیے۔ اور اُن کی تالیفِ قلب کرتے رہیے تا آنکہ ایمان اُن کے دلوں میں گھر کر لے، پھر وہ خود بخود زکاۃ ادا کریں گے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اِس رائے کو سختی سے مسترد کر دیا۔ اُنھوں نے کہا کہ جو زکاۃ نہیں دے گا میں اس سے جنگ کروں گا۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اعتراض کیا کہ ہم لوگوں سے آخر کس بات پر لڑیں جبکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا ہے:

> ''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے قتال کروں تا آنکہ وہ شہادت دینے لگیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کا رسول ہے۔ اگر وہ یہ بات کہیں گے تو اپنی جانیں اور اپنے اموال مجھ سے بچا پائیں گے، ماسوائے اُن باتوں کے جن میں کسی کی جان لینی یا کسی کا مال لینا درست ہے۔''[1]

خلیفۂ رسول نے اُن کے جواب میں فرمایا: ''اللہ کی قسم! بکری کا ایک بچہ جو وہ رسول اللہ کو زکاۃ میں ادا کرتے تھے، مجھے زکاۃ میں نہیں دیں گے تو میں اِس پر بھی اُن سے لڑوں گا۔ زکاۃ مال کا حق ہے۔ جو آدمی نماز اور زکاۃ میں فرق کرے گا میں بخدا! اُس سے ضرور لڑوں گا۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا کہنا ہے کہ تب مجھے اندازہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ابوبکر کو اس معاملے میں شرح صدر عطا فرمائی ہے۔ اور اگر وہ مانعینِ زکاۃ سے لڑائی پر آمادہ ہیں تو بالکل حق بجانب ہیں۔

اِس معاملے کے متعلق حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا کہنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہم نے جو موقف اختیار کیا تھا، عین ممکن تھا کہ ہم اُس کی وجہ سے

[1] صحيح البخاري، حديث: 1399.

ہلاکت میں پڑ جاتے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ابوبکر جیسی نعمت سے نہ نوازا ہوتا تو ہم نے تو اتفاق کرلیا ہوتا کہ کم از کم زکاۃ کے اونٹوں کی وجہ سے لڑائی مول نہیں لیں گے۔ ہم اس پر قانع ہو جاتے کہ عربوں کی مہمان نوازی کا لطف اٹھائیں گے اور اطمینان سے اللہ کی عبادت میں مشغول رہیں گے۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ابوبکر کے دل میں یہ بات بٹھادی کہ مانعین زکاۃ یا تو زکاۃ دینے پر آمادہ ہوں گے یا وہ اُن سے لڑائی کریں گے۔

اُن کے نزدیک مانعینِ زکاۃ کے لیے دو ہی راستے تھے۔ یا تو انھیں ذلت آمیز شکست کا سامنا کرنا پڑے گا۔ انھیں یہ اقرار کرنا پڑے گا کہ اُن کے مقتولین جہنم واصل ہیں اور ہمارے شہداء جنت کے باسی۔ دوسرے وہ ہمارے شہداء کی دیت ادا کریں گے۔ تیسرے اُن کا جتنا مال متاع ہمارے ہاتھ آیا وہ ہمارے لیے مالِ غنیمت ہوگا۔ ہمارا جو ساز وسامان انھوں نے حاصل کیا وہ انھیں لوٹانا پڑے گا۔

اگر یہ باتیں منظور نہیں تو پھر اُنھیں جلاوطن ہونا پڑے گا۔ انھیں اُن کے علاقوں سے نکال باہر کیا جائے گا۔ یوں مسلمانوں نے اتفاق رائے سے طے کرلیا کہ اہل ارتداد اور مانعین زکاۃ یا تو اسلام قبول کر کے زکاۃ ادا کریں گے یا پھر اُن سے لڑائی کی جائے گی۔

خلیفہ رسول نے اس عظیم الشان مہم کے لیے گیارہ فوجی دستے ترتیب دیے۔ حضرت خالید بن ولید رضی اللہ عنہ کی دلیرانہ قیادت میں پہلا فوجی دستہ طلیحہ بن خویلد اور مالک بن نویرہ کو سبق سکھانے کے لیے روانہ ہوا۔ دوسرا فوجی دستہ حضرت عکرمہ بن ابی جہل رضی اللہ عنہ کی کمان میں مسیلمہ کذاب کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوا۔ تیسرے فوجی دستے کے قائد حضرت مہاجر بن ابی امیہ رضی اللہ عنہ تھے۔ خلیفہ رسول نے انھیں حکم دیا کہ وہ یمن جا کر اسود عنسی کے خلاف نبرد آزما ہوں۔ حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں چوتھا فوجی دستہ

بالائی شام کے محاذ پر پہنچا۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی مدبرانہ قیادت میں پانچواں فوجی دستہ قضاعہ، ودیعہ اور بنی حارث سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے آگے بڑھا۔ چھٹے فوجی دستے کے سپہ سالار حضرت حذیفہ بن محصن رضی اللہ عنہ تھے۔ خلیفۂ رسول نے انھیں دبا کی مہم پر روانہ فرمایا۔ ساتویں فوجی دستے کی زمامِ قیادت حضرت عرفجہ بن ہرثمہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تھی۔ اُنھیں مہرہ کی مہم سونپی گئی۔ حضرت شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ کی جرأت مندانہ قیادت میں آٹھواں فوجی دستہ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کی کمک کے طور پر عازمِ سفر ہوا۔ یاد رہے کہ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کو مسیلمہ کذاب کی سرکوبی کے لیے بھیجا گیا تھا۔ نواں فوجی دستہ جس کے سپہ سالار حضرت معن بن حاجز سلمی رضی اللہ عنہ تھے، اُسے بنوسلیم کے محاذ پر بھیجا گیا۔ حضرت سوید بن مقرن حضرمی رضی اللہ عنہ کی قیادت میں دسواں فوجی دستہ بحر احمر کے ساحل پر روانہ ہوا۔ گیارھواں فوجی دستہ حضرت علاء حضرمی کے زیرِ قیادت بحرین کی طرف روانہ ہوا۔

اِن گیارہ فوجی دستوں کی روانگی سے پیشتر خلیفۂ رسول نے ہر سپہ سالار کو ایک خط دیا جس میں مرقوم تھا:

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ خلیفۂ رسول ابوبکر کی طرف سے، عوام و خواص کے نام جنھیں میرا یہ خط ملے۔ وہ اسلام پر قائم رہے ہوں یا دائرہ اسلام سے نکل گئے ہوں۔ ان لوگوں کو سلام جنھوں نے ہدایت کا اتباع کیا اور ہدایت پانے کے بعد گمراہ نہیں ہوئے۔ میں آپ کے ساتھ مل کر اللہ کی حمد کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ میں گواہ ہوں اِس بات کا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ اکیلا ہے۔ اُس کا کوئی شریک نہیں۔ اور اِس بات کا بھی گواہ ہوں کہ محمد اُس کا بندہ اور رسول ہے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو

پیغام ہدایت لے کر آئے ہم اُس کا اقرار کرتے ہیں اور جو اُس کا انکار کرے، ہم اس کا انکار کرتے اور اُس سے جہاد کرتے ہیں۔

اما بعد! اللہ تعالیٰ نے محمد (ﷺ) کو اپنی طرف سے حق کے ساتھ مبعوث کیا۔ اس نے آپ کو تمام انسانوں کی طرف بشارت دہندہ، انتباہ کنندہ اور داعی اِلیَ اللہ بنا کر بھیجا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو روشن چراغ بنایا تا کہ آپ اُن افراد کو انتباہ کریں جو بقید حیات ہیں اور کافروں پر اتمام حجت بھی ہو جائے۔

چنانچہ جن لوگوں نے رسول اللہ کی طرف سے دعوت الی اللہ قبول کی، اللہ تعالیٰ نے انھیں ہدایت حق سے نوازا۔ جن لوگوں نے آپ کی بات سن کر پیٹھ پھیری اور بھاگ اٹھے، رسول اللہ نے باذن الٰہی انھیں مارا تا آنکہ وہ خواہی نخواہی اسلام کی طرف چلے آئے، پھر رسول اللہ ﷺ نے وفات پائی جبکہ آپ اللہ کے حکم کی تعمیل کر چکے، امت کی خیر خواہی کا کام انجام دے چکے اور اپنی ذمے داری نبھا چکے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی نازل کردہ کتاب میں آپ کو اور اہل اسلام کو بتا دیا تھا:

﴿ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ﴾

''بلاشبہ تم مرنے والے ہو اور یہ بھی مرنے والے ہیں۔''[1]

اور یہ:

﴿ وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ؕ اَفَاۡئِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ○ ﴾

''اور ہم نے تجھ سے پہلے کسی بشر کے لیے جاودانی نہیں رکھی۔ سو اگر تو مر گیا تو کیا یہ ہمیشہ رہیں گے؟''[2]

[1] الزمر 30:39. [2] الأنبياء 34:21.

اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو مخاطب کر کے فرمایا:

﴿ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۝ ﴾

''اور محمد بھی ایک رسول ہی ہے۔ اُس سے پہلے کئی رسول گزر چکے۔ سو کیا اگر وہ فوت ہو جائے یا قتل کر دیا جائے تو تم اپنی ایڑیوں پر پھر جاؤ گے اور جو اپنی ایڑیوں پر پھر جائے گا وہ اللہ کو ہرگز کچھ بھی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ اور اللہ شکر کرنے والوں کو جلد جزا دے گا۔'' [1]

''سو جو آدمی محمد کو پوجتا تھا وہ اچھی طرح جان لے کہ محمد وفات پا چکے ہیں۔ اور جو صرف اکیلے اللہ کی عبادت کرتا تھا جس کا کوئی شریک نہیں، وہ یہ سمجھ لے کہ اللہ اُس کی تاک میں ہے۔ وہ زندہ ہے۔ وفات نہیں پائے گا۔ اسے نہ تو اونگھ آتی ہے نہ نیند۔ وہ اپنے دین کا محافظ ہے۔ اپنے دشمن سے انتقام لینے والا ہے۔

میں تمھیں اللہ کے تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں۔ اپنے نبی کی تعلیمات میں سے جو کچھ تمھارے حصے میں آتا ہے، اسے حاصل کرو۔ نبوی ہدایت اپناؤ۔ اللہ کے دین پر ثابت قدمی سے قائم رہو۔ جسے اللہ تعالیٰ نے ہدایت نہیں دی وہ بلاشبہ گمراہ ہے۔ جسے اُس نے عافیت نہیں دی وہ مبتلائے آفات ہے۔ جس کی مدد اللہ نے نہیں کی وہ بیچارا تو بے یار و مددگار ہے۔ جس کی رہنمائی اللہ کے علاوہ کسی اور نے کی وہ بھی گمراہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

---

[1] آل عمرٰن 3:144.

﴿ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ۝ ﴾

''جسے اللہ ہدایت دے سو وہی ہدایت پانے والا ہے اور جسے وہ گمراہ کر دے، پھر تجھے اُس کے لیے رہنمائی کرنے والا کوئی دوست ہرگز نہیں ملے گا۔'' [1]

''دنیا میں کسی آدمی کا کوئی عمل قبول نہیں، یہاں تک کہ وہ اسلام کا اقرار کرے۔ آخرت میں بھی اسلام ہی سے کام چلے گا۔ اس کا متبادل کسی صورت قابل قبول نہیں ہوگا۔ اِس سلسلے میں کوئی حیلہ بہانہ بھی تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ تم میں سے بعض افراد نے قبولِ اسلام کے بعد اللہ کے متعلق دھوکا کھا کر، دین کو نہ سمجھ کر اور شیطان کا کہنا مان کر اسلام کو چھوڑ دیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ۗ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ۚ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ۝ ﴾

''اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا آدم کو سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، وہ جنات میں سے تھا، سو اس نے اپنے رب کی نافرمانی کی۔ تو کیا تم مجھے چھوڑ کر اُسے اور اُس کی اولاد کو دوست بناتے ہو حالانکہ وہ تمھارے دشمن ہیں۔ وہ (شیطان) ظالموں کے لیے بطور بدل بُرا ہے۔'' [2]

ایک اور موقع پر فرمایا:

﴿ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ۚ اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝ ﴾

[1] الکہف 17:18. [2] الکہف 50:18.

’’بلاشبہ شیطان تمھارا دشمن ہے۔ سو اسے دشمن ہی بناؤ۔ وہ اپنے گروہ کو صرف اس لیے بلاتا ہے کہ وہ آگ والوں میں سے ہو جائیں۔‘‘ [1]

’’میں نے فلاں صاحب کی قیادت میں تمھارے پاس مہاجرین و انصار اور تابعین کا لشکر بھیجا ہے۔ میں نے اُن صاحب کو حکم دیا ہے کہ وہ کسی سے ایمان باللہ کے سوا کچھ قبول نہ کریں۔ اور یہ بھی کہ وہ دعوت الی اللہ دینے سے پہلے کسی کو قتل نہ کریں۔ اگر کوئی دعوت اِلی اللہ قبول کر لے، اسلام کا اقرار کر لے اور عملِ صالح کا وعدہ کرے تو اُس کی بات تسلیم کر کے اُس کی مدد کی جائے۔ اور اگر کوئی انکار کرے تو اس سے لڑائی کی جائے یہاں تک کہ انکار کرنے والا اللہ کے دین کی طرف لوٹ آئے۔‘‘ [2]

اہل ارتداد کی سرکوبی کے لیے فوجی دستوں کی روانگی

وحشی بن حرب رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو اہل ارتداد کے خلاف روانہ ہونے والے فوجی دستوں کا سپہ سالارِ اعلیٰ (Commander-in-chief) مقرر کیا تو فرمایا: ’’میں نے ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا تھا کہ خالد بن ولید اللہ کا اچھا بندہ اور قبیلے کا اچھا فرد ہے۔ یہ اللہ کی ایک تلوار ہے جسے اللہ نے کافروں اور منافقوں کے خلاف سونت رکھا ہے۔‘‘ [3]

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اپنے فوجی دستے کو ہمراہ لیے ذوالقصہ سے روانہ ہوئے۔ خلیفۂ رسول نے انھیں حکم دیا کہ سب سے پہلے طلیحہ اسدی کی خبر لیجیے۔ طلیحہ اسدی اپنی قوم کے علاقے دیارِ بنی اسد میں مقیم تھا۔ اہل غطفان بھی وہیں رہتے تھے۔ بنی عبس

[1] فاطر 6:35. [2] البداية والنهاية لابن كثير:356/6. [3] مسند أحمد:216/1.

اور بنی ذبیان بھی ان کے ساتھ جا ملے تھے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور طلیحہ اسدی کا آمنا سامنا موضع بزاخہ میں ہوا۔ بدوؤں کی کثیر تعداد جنگ کا تماشا دیکھنے آئی تھی۔

طلیحہ اپنے حلیف قبائل کے ہمراہ آچکا تھا۔ بنی فزارہ کا سردار عیینہ بن حصن بھی فزارہ کے سات سو جنگ آزماؤں کے ہمراہ آموجود ہوا۔ وہ بھی طلیحہ کا حلیف تھا۔ دونوں فوجیں صف آرا ہوئیں۔ طلیحہ نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کر رکھا تھا۔ وہ چادر اوڑھ کر وحی اترنے کا ڈھونگ رچایا کرتا تھا۔ میدانِ جنگ میں بھی چادر اوڑھ کر بیٹھ گیا۔ عیینہ فوج کی صفوں میں شامل ہو کر لڑنے لگا۔ وہ جب بھی لڑائی سے اکتا جاتا، سیدھا طلیحہ کے پاس آتا اور پوچھتا: ''کیوں! جبریل آیا؟''

طلیحہ نفی میں جواب دیتا۔ عیینہ پلٹ جاتا۔ لڑتے لڑتے پھر اوب جاتا تو واپس آتا اور پھر پوچھتا: ''کیوں بے! جبریل آیا کہ نہیں۔''

تیسری مرتبہ جب وہ واپس آیا اور طلیحہ سے پوچھا تو اُس نے جواب دیا کہ ہاں، جبریل آیا تھا۔

''کیا کہا اُس نے؟'' عیینہ نے بے قراری سے پوچھا۔

''اس نے کہا ہے کہ تیری بھی ایک چکی ہے، اُس کی چکی جیسی۔ اور ایک بات جسے تو کبھی نہیں بھولے گا۔'' طلیحہ نے منہ بنا کر بظاہر بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

''میرا بھی یہی خیال ہے کہ تمھارے متعلق کوئی بات ایسی ضرور ہوگی جسے تم کبھی نہیں بھولو گے۔''

اتنا کہہ کر عیینہ بن حصن نے اپنے قبیلے کو آواز دی:

''بنی فزارہ! چلو، واپس چلتے ہیں۔''

بنی فزارہ تو چل دیے۔ اُدھر طلیحہ کی فوج میں بھی بھگدڑ مچ گئی۔

طلیحہ نے شکست سامنے دیکھی تو گھوڑے پر سوار ہوا جو اس نے اسی وقت کے لیے تیار کر رکھا تھا۔ اپنی بیوی نوار کو اونٹ پر سوار کیا اور شام کی طرف بھاگ گیا۔ اُس کی فوج تتر بتر ہوگئی۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے عیینہ بن حصن کو گرفتار کر لیا اور مشکیں کس کر مدینہ روانہ کر دیا۔ وہ مدینے میں داخل ہوا تو بچے اور لڑکے بالے اُس کے ساتھ ساتھ بھاگتے، اُسے انگلیوں کے کچوکے لگاتے اور کہتے: ''ارے اللہ کے دشمن! تو اسلام کو چھوڑ کر مرتد ہو گیا تھا؟''

وہ بھی اپنی نوع کا ایک ہی مسخرا تھا۔ کہتا: ''میں ایمان لایا ہی کب تھا جو مرتد ہوتا۔''[1]

خلیفۂ رسول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے اُس سے توبہ کرائی۔ اس نے توبہ کر لی تو آپ نے اُسے معاف کر دیا۔ بعدازاں عیینہ بن حصن کے اسلام میں بڑی خوبی آ گئی۔

کئی روز بعد خبر ملی کہ طلیحہ نے بھی دوبارہ اسلام قبول کر لیا ہے، چنانچہ وہ خلافت صدیقی ہی میں عمرہ کرنے مکہ آیا۔ مارے شرم کے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے چھپتا پھرتا تھا۔ خلیفۂ رسول جب تلک زندہ رہے، وہ آپ کا سامنا نہیں کر پایا۔ مکہ سے واپس آ کر طلیحہ اسدی، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی افواج میں شامل ہو گیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو پتہ چلا تو آپ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو لکھا:

''جنگ کے معاملات میں طلیحہ اسدی سے مشورہ کر لیا کیجیے، تاہم اُسے کسی دستے کا سپہ سالار مت بنائیے گا۔''

[1] الکامل لابن الأثیر:2/348.

یوں مسلمانوں نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی شجاعانہ اور دانشمندانہ قیادت میں اہل ارتداد کے خلاف فتح پائی۔ خلیفۂ رسول کو فتوحات کی خوشخبری ملی تو آپ نے سپہ سالار اعلیٰ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو لکھا:

''اللہ تعالیٰ نے آپ کو جن انعامات سے نوازا ہے اُن کی وجہ سے آپ کی بھلائیوں میں اضافہ ہونا چاہیے۔ تمام معاملات میں تقویٰ اختیار کیجیے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کے ساتھ ہے جو تقویٰ اختیار کرتے اور نیکی کی راہ پر گامزن رہتے ہیں۔ خوب تگ و دو کیجیے۔ نرم مت پڑیے گا۔ ایسے کسی مشرک کو مت چھوڑیے گا جس نے کسی مسلمان کا قتل کیا ہو۔''

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اپنی افواج کے ہمراہ بزاخہ میں مہینہ بھر قیام کیا، پھر یہ لشکر جرار سلمیٰ بنت مالک اور مالک بن نویرہ کی فوجوں سے نمٹتا ہوا مسیلمہ کذاب سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے یمامہ جا پہنچا۔

مسیلمہ کذاب کا انجام

مسیلمہ کذاب نے مسلمانوں سے مقابلے کے لیے بہت بڑی جمعیت مہیا کر رکھی تھی اس نے میمنہ پر محکم بن طفیل کو اور میسرہ پر رجال بن عنفوہ کو مقرر کیا۔ دونوں لشکر آمنے سامنے آئے تو مسیلمہ نے اپنی سپاہ کو مخاطب کر کے جوشیلے انداز میں کہا: آج کا دن غیرت کا دن ہے۔ آج اگر تم ہار گئے تو تمھاری عورتوں کو لونڈیاں بنا کر اُن سے بنا سگائی کے بیاہ کر لیا جائے گا۔ اِس لیے لڑو، اپنی نسلوں کو بچاؤ اور اپنی عورتوں کا دفاع کرو۔''[1]

مسلمانوں نے پڑاؤ کے لیے جس ٹیلے کا انتخاب کیا تھا، اُس پر سے یمامہ بھر پر نظر

[1] الکامل لابن الأثیر:2/362.

پڑتی تھی۔ مہاجرین کا جھنڈا حضرت سالم مولیٰ ابی حذیفہ رضی اللہ عنہ نے تھام رکھا تھا جبکہ انصار کا علم حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تھا۔ دیگر تمام قبائل کے اپنے اپنے پرچم تھے۔ جنگ کے پہلے مرحلے میں بدو شکست کھا گئے۔ بنو حنیفہ بڑھتے بڑھتے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے خیمے میں آ گھسے۔ تب صحابہ کرام نے ایک دوسرے کو جوش دلایا۔ حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ نے انھیں مخاطب کر کے کہا: ''تم نے اپنے جوڑی داروں کو بُرے راستے پر ڈال دیا ہے۔'' تب ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں: ''یا خالد! ہمیں آگے بڑھنے کا موقع دیجیے۔''

چنانچہ مہاجرین و انصار کی ایک ٹکڑی نہایت دلیری سے آگے بڑھی۔ بنوحنیفہ کے مرتد بھی ایسی بے جگری سے لڑے کہ کہیں دیکھی نہ سنی۔ صحابۂ کرام تو ایک دوسرے کو وصیتیں کرنے لگے۔ حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ جو انصار کے علمبردار تھے، سر پر کفن لپیٹے اور خوشبو لگائے، جھنڈا تھامے نہایت ثابت قدمی سے کھڑے تھے۔ انھوں نے خود کو نصف ساق تک زمین میں گاڑ رکھا تھا۔ انھیں بھی ہر طرف سے حملہ کر کے وہیں شہید کر دیا گیا۔

مہاجرین نے حضرت سالم مولیٰ ابی حذیفہ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ ہمیں خدشہ ہے، آپ کی طرف سے بند ٹوٹے گا اور ہم پر حملہ ہوگا۔ حضرت سالم رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ تب تو میں قرآن کا بُرا قاری ہوں گا۔ حضرت زید بن خطاب رضی اللہ عنہ نے بآواز بلند پکارا: ''لوگو! ہمت سے کام لو۔ دشمن پر کاری ضرب لگاؤ۔ آگے بڑھتے چلو۔''

پھر فرمایا: ''واللہ! میں آج نہیں بولوں گا تاوقتیکہ اللہ تعالیٰ دشمن کو شکست دے دے یا پھر میں اللہ تعالیٰ سے جاملوں اور اس سے ہم کلام ہوں۔'' انھوں نے بھی نہایت بہادری سے لڑتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا۔

حضرت ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ نے پکار کر کہا: ''اہل قرآن! قرآن کو اپنے کارناموں سے زینت دو۔'' یہ کہہ کر انھوں نے دشمن پر حملہ کر دیا اور اُنھیں دور تک دھکیل دیا۔ آخر لڑتے لڑتے انھوں نے بھی شہادت کا جام پیا۔

ادھر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے یکبارگی نہایت زوردار حملہ کیا۔ دشمن کی صفیں چیرتے ہوئے دوسری طرف جا نکلے، پھر مسیلمہ کذاب کا رخ کیا لیکن واپس پلٹے اور صفوں کے درمیان پہنچ کر مبارز طلبی کی۔ انھوں نے للکار کہا:

''میں ہوں ولید کا بیٹا۔ میں ہوں عامر اور زید کا فرزند۔''

پھر مسلمانوں کا شعار (نشانِ امتیاز) پکارا: ''وامحمداہ۔''

اللہ کی تلوار نے اپنی تیز دھار کے خوب خوب جوہر دکھائے۔ دشمن کا جو بھی آدمی اُن کے مقابلے میں آتا اُسے کاٹ ڈالتے۔ جو بھی قریب آتا اُسے مٹا ڈالتے۔ یوں مسلمانوں کا پلہ بھاری ہوگیا اور وہ بڑھتے بڑھتے مسیلمہ کذاب کے نہایت قریب جا پہنچے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے مسیلمہ کو خبردار کیا کہ تمھارے لیے نجات کے دو ہی راستے ہیں۔ دین حق کی طرف رجوع کرو یا پھر اپنی اراضی کی نصف پیداوار بطور جزیہ مدینہ پہنچایا کرو۔ تیسرا راستہ تمھاری ہلاکت کا ہے۔

پہلی دونوں باتوں کے جواب میں مسیلمہ کے شیطان نے اُس کا سر نفی میں پھیر دیا۔ وہ دونوں باتوں میں سے کوئی بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔ مسیلمہ جونہی کوئی بات تسلیم کرنا چاہتا، اُس کا شیطان اُسے منع کر دیتا۔ وہ پوری طرح سے اپنے شیطان کا تابع تھا۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ لوٹ آئے اور لشکر کو ازسرِ نو ترتیب دیا۔ مہاجرین و انصار اور دیگر قبائل کی علیحدہ علیحدہ صفیں بنائیں تاکہ پتہ چلے کہ دشمن کس طرف سے

غالب ہوتا ہے۔ صحابہ کرام نے اِس معرکے میں بے مثال صبر و ثبات کا مظاہرہ کیا۔ انھوں نے یکبارگی بھرپور حملہ کیا۔ کافروں کے چھکے چھوٹ گئے اور وہ سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا۔ جو جو ہاتھ آیا اُسے تہ تیغ کیا۔ جو باقی بچ رہے وہ حدیقۂ موت (موت کے باغ) کی چار دیواری میں جا گھسے۔ وہاں گھسنے کا مشورہ انھیں محکم بن طفیل نے دیا تھا۔ ملعون مسیلمہ بھی وہیں موجود تھا۔ محکم بن طفیل اپنی قوم کو ہدایات دے رہا تھا کہ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ نے اسے دیکھ لیا۔ انھوں نے تاک کر تیر مارا۔ محکم بن طفیل وہیں ڈھیر ہو گیا۔

اُدھر بنو حنیفہ نے باغ کا دروازہ بند کر لیا۔ مسلمانوں نے باغ کا گھیراؤ کر لیا اور اندر داخل ہونے کی کوشش کرنے لگے۔ حضرت براء بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا کہ مجھے ڈھال پر بٹھاؤ اور دیوار پر سے دوسری جانب پھینک دو۔ وہ بڑی ڈھال پر بیٹھ گئے۔ لوگوں نے ڈھال کو نیزوں سے اوپر اٹھایا اور وہ دیوار پر سے باغ کے اندر کود گئے۔ اندر کودتے ہی وہ تلوار چلاتے ہوئے سیدھے دروازے کی طرف بڑھے۔ دربانوں کو تہ تیغ کیا اور دروازہ کھول دیا۔ مسلمانوں کا لشکر باغ میں جا داخل ہوا۔ اہل ارتداد کی تو شامت آگئی۔ جو بھی سامنے آیا، کاٹ کر رکھ دیا گیا۔ کچھ افراد مسیلمہ کذاب تک جا پہنچے۔ حضرت وحشی بن حرب رضی اللہ عنہ نے دور کھڑے تاک کر برچھے کا وار کیا جو مسیلمہ کے بدن کو چیرتا ہوا نکل گیا۔ وہ گر پڑا۔ حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور تلوار کے پے در پے وار کر کے اس لعین کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اتنے میں ایک عورت نے محل کی چھت پر سے آواز لگائی: ''ہائے! حسن و جمال کے امیر کو کالے غلام نے مار ڈالا۔''

مسیلمہ کذاب جہنم واصل ہوا تو جزیرہ نمائے عرب میں سے گویا ارتداد کی جڑ اکھڑ

گئی۔ اس کا کفر ٹوٹتے ہی فتنۂ ارتداد کے گھناؤنے درخت کی تمام شاخیں خود بخود سوکھ گئیں۔ عرب قبائل اسلام کی طرف لوٹ آئے اور زکاۃ کا مال پھر سے مدینے پہنچنے لگا۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے بعد خلیفۂ رسول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی جرأت مندانہ قیادت کی وجہ سے ممکن ہوا۔

وفاتِ حسرت آیات

خلیفۂ رسول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جاں کنی کے عالم میں تھے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تشریف لائیں۔ انھوں نے والدِ محترم کو جاں بلب دیکھا تو ضبط نہ کر پائیں اور رونے لگیں۔

خلیفۂ رسول نے اُن سے فرمایا: ''میں نے تمھیں ایک باغ تحفے میں دیا تھا۔ اُس کے متعلق میرے دل میں خلش سی ہے۔ تم وہ باغ میری وراثت میں لوٹا دو۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اثبات میں جواب دیا۔ انھوں نے وہ باغ والدِ محترم کی وراثت میں لوٹا دیا۔

خلیفۂ رسول نے مزید فرمایا:

''یاد رکھنا! جب سے ہمیں مسلمانوں کی ذمہ داری سونپی گئی، ہم نے اُن کا کوئی دینار و درہم نہیں کھایا۔ اتنا البتہ ضرور ہے کہ ہم اُن کے کھانے میں سے روکھی سوکھی پیٹ میں ڈالتے اور اُن کے کپڑوں میں سے موٹا جھوٹا پشت پر اوڑھتے رہے۔ مسلمانوں کے مال میں سے ہمارے پاس اِس حبشی غلام، پانی ڈھونے والے اونٹ اور اِس بوسیدہ گدیلے کے سوا کچھ نہیں۔''

تاکید فرمائی کہ میں مرجاؤں تو اِن تینوں کو عمر کے ہاں بھیج دیجیو اور بری الذمہ ہو جائیو۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حسبِ تاکید غلام، اونٹ اور گدیلا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاں بھیج دیے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ گھر پر تشریف فرما تھے۔ غلام، اونٹ اور گدیلا دیکھ کر رونے لگے۔ فرمایا: ''اللہ تعالیٰ ابوبکر پر رحمت نازل کرے۔ انھوں نے بعد میں آنے والے خلیفے کو بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو خلیفۂ رسول نے ایک اور تاکید یہ فرمائی کہ دیکھو، مجھے اِنھی پرانی چادروں کا کفن دلوائیو۔ زندہ کو مردہ کی نسبت نئے کپڑے کی زیادہ ضرورت پڑتی ہے۔

اسلام کے پہلے خلیفہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے منگل کی رات 22 جمادی الثانی 13ھ کو وفائی پائی۔ مدتِ خلافت تھی: دو برس، تین مہینے اور دس دن۔

ابتدا میں مندرجہ آیات کی شانِ نزول کے سلسلے میں امام خازن نے اپنی تفسیر «لُباب التاویل» میں لکھا:

''آیت کا دائرۂ انطباق خاصا وسیع ہے۔ درست تر یہ ہے کہ یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے متعلق نازل ہوئی تھی۔ تفصیل اِس اجمال کی یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ شام کے تجارتی سفر میں ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک اُس وقت بیس برس کی تھی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اٹھارہ برس کے تھے۔ دورانِ سفر ایک منزل پر پڑاؤ کیا جہاں ایک بیری استادہ تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بیری کے سائے میں تشریف فرما ہوئے۔ اُس منزل پر ایک راہب بھی اقامت پذیر تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ دین کی باتیں سننے اُس راہب کے پاس گئے۔ اُس نے آپ سے دریافت کیا کہ یہ بیری کے سائے میں کون بیٹھا ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ یہ محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب ہیں۔ راہب نے کہا یہ بخدا نبی ہے۔ اُس بیری

کے سائے میں عیسیٰ علیہ السلام کے بعد آج تک کوئی نہیں بیٹھا۔ یہ نبی آخر الزماں۔ [1]
حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اُسی روز سے یقین ہو گیا تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبیِ آخر الزماں ہیں، چنانچہ وہ سفر و حضر میں آپ کے ہمراہ رہتے۔ آپ چالیس برس کے ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو مبعوث فرمایا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ پر بے چون و چرا ایمان لے آئے۔ اُس وقت ان کی عمر اڑتیس برس کی تھی۔ وہ چالیس برس کے ہوئے تو انھوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کی:

﴿ قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ ﴾

”اے میرے رب! مجھے توفیق دے کہ شکر کروں تیری نعمت کا جو تو نے انعام کی مجھ پر اور میرے والدین پر۔“ [2]

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے آیت ﴿ وَوَصَّیْنَا الْاِنْسٰنَ بِوَالِدَیْهِ اِحْسٰنًا ﴾ کے متعلق فرمایا کہ یہ آیت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی شان میں نازل ہوئی تھی۔ ان کے ماں باپ دونوں اسلام لائے تھے۔ اُن کے علاوہ مہاجرین میں کسی اور کو یہ اعزاز حاصل نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں والدین سے حسنِ سلوک کی وصیت فرمائی۔ یوں تمام مسلمانوں پر بھی یہ امر لازم ٹھہرا کہ وہ والدین سے اچھا برتاؤ کریں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اگلی دعا حسبِ ذیل تھی:

﴿ وَاَنْ اَعْمَلَ صٰلِحًا تَرْضٰىهُ ﴾

”اور (مجھے توفیق دے کہ) عمل کروں نیک جس پر تو راضی ہو۔“ [3]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی یہ دعا بھی قبول

---

[1] تفسیر الخازن والبغوي: 124/6. [2] الأحقاف 15:46. [3] النمل 27:19.

فرمائی۔ انھوں نے نو اہل ایمان کو آزاد کرایا جنھیں راہِ خدا میں ایذائیں دی جاتی تھیں۔ انھی میں بلال بھی تھے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جب بھی نیکی کرنے کا ارادہ کیا، اللہ تعالیٰ نے اُن کی مدد فرمائی۔''

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مزید یہ دعا فرمائی:

﴿ وَاَصۡلِحۡ لِیۡ فِیۡ ذُرِّیَّتِیۡ ﴾

''اور اصلاح فرما میرے لیے میری ذریت کی۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے اُن کی اس دعا کو بھی یوں شرفِ قبولیت بخشا کہ ان کی کوئی اولاد ایسی نہیں تھی جو ایمان نہیں لائی۔ آپ کے والد حضرت ابو قحافہ عثمان بن عمرو رضی اللہ عنہ، والدہ حضرت ام خیر بنت صخر بن عمر رضی اللہ عنہا، فرزند حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ اور ان کے فرزند حضرت محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ، ان چاروں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا اور آپ پر ایمان لائے تھے۔ یہ اعزاز بھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سوا کسی اور صحابی کو حاصل نہیں۔

امام سیوطی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب تفسیر دُرمنثور میں لکھا کہ ابن مردویہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ تفسیری قول نقل کیا کہ یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے متعلق نازل ہوئی۔[2]

اختتامیہ

فتوحاتِ اسلامی کی تفصیلات پڑھ کر عام ذہنوں میں یہ سوالات جنم لیتے ہیں کہ

---

[1] الأحقاف 46:15. [2] الدر المنثور للسيوطي: 41/6، وجامع البيان لابن جرير الطبري: 17/26، و تفسير أحكام القرآن للقرطبي: 195/16.

ارتداد کی جنگیں کیوں لڑی گئیں۔ اسلام میں جہاد کیوں فرض کیا گیا اور کیا وجہ تھی کہ اسلامی لشکروں کو جزیرہ نمائے عرب کے باہر نکل کر ترک تازیاں کرنی پڑیں۔

کیا وہ اِس لیے جزیرہ نمائے عرب کے باہر نکلے تھے کہ اپنے دین (اسلام) کو بزورِ شمشیر دوسروں پر مسلط کر ڈالیں؟ دنیا بھر میں فتوحات کا سلسلہ کیا انھوں نے محض اس لیے پھیلایا تھا کہ لوگوں کو نئے دین کی قوت اور طاقت باور کرائیں؟ درحقیقت قرآن مجید نے اِس امر پر زور دیا ہے کہ لوگوں کو قبولِ اسلام کے لیے مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ وہ دعوتِ اسلام کا یہ طریقہ بتلاتا ہے کہ عقلی دلائل دے کر لوگوں کو دین اسلام کی حقانیت سے روشناس کرانا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے جب اپنے بعض اقربا کو نہایت اصرار سے قبولِ اسلام کی ترغیب دلائی تو اللہ تعالیٰ نے آپ پر یہ وحی نازل فرمائی:

﴿ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝ ﴾

''تو کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا تاکہ وہ مومن بن جائیں۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے تمام بنی نوع انسان کے لیے علانیہ فرما دیا:

﴿ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ﴾

''دین میں کچھ زبردستی نہیں۔ ہدایت، گمراہی کے مقابلے میں خوب واضح ہو چکی۔''[2]

اسلام نے دعوت الی اللہ کا جو طریقہ بتلایا ہے اس کے مطابق دعوت دیتے وقت اچھی بات کہنی چاہیے۔ اس سلسلے میں نرم رویہ اختیار کرنا اور لوگوں کو اچھے انداز سے قائل کرنا چاہیے۔ ارشادِ ربانی ہے:

[1] یونس 10:99. [2] البقرة 2:256.

﴿ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ﴾

''اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلا۔ اور بحث کر اُن کے ساتھ اس طریقے سے جو سب سے اچھا ہے۔''[1]

اگر بات ایسی ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے جزیرے سے نکل کر زمین کے اطراف واکناف میں جانے کی کیا ضرورت پیش آئی تھی؟ کیا ان کے رسول نے انھیں ایسا کرنے کا حکم دیا تھا؟

بات دراصل یہ ہے کہ مسلمان اللہ تعالیٰ کا دین پھیلانے کے لیے جزیرہ نمائے عرب سے باہر آئے تھے۔ وہ دنیا کو نئے دین کی خوشخبری دینے نکلے تھے۔ ان کی پیش قدمی کا مقصد صرف یہ تھا کہ اللہ کا کلمہ سب سے بلند ہو جائے۔

اسلام کی جہادی تحریک کا پہلا اور آخر مقصد یہی تھا۔ اس امر کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے تین قسم کے جنگ آزماؤں کے متعلق پوچھا گیا کہ ان میں اللہ کی راہ پر کون ہے۔ ایک وہ جنگ آزما جو صرف غنیمت پانے کے لیے لڑتا ہے۔ دوسرا وہ شخص جو نام نمود کے لیے دشمن سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ تیسرا وہ شخص جو اپنی بہادری کی دھاک بٹھانے کے لیے جنگ میں شریک ہوتا ہے۔

فرمایا: ''جو جنگ آزما اِس لیے برسر پیکار آتا ہے کہ اللہ کا کلمہ سب سے بلند ہو جائے، وہی اللہ کے راستے پر ہے۔''[2]

یوں نئے نئے شہروں پر قبضہ کرنا جہادِ اسلامی کا مقصود نہیں، نہ یہ مقصود ہے کہ اقتصادی ترقی یا اقتصادی استحکام حاصل کیا جائے۔ نہ یہ کہ دوسروں کے خرچ پر زندگی کی سہولیات

[1] النحل 16/125. [2] صحيح البخاري، حديث: 2810.

اور آسائشیں فراہم کر لی جائیں۔ اسلام کی جہادی تحریک کا بنیادی محرک یہ ہے کہ اللہ کا کلمہ سب سے بلند ہو جائے۔ تاہم گھر بار کے دفاع میں لڑنا بھی جہاد فی سبیل اللہ کا ایک اہم جز ہے۔ مال متاع کی حفاظت کے لیے لڑنا بھی جہاد فی سبیل اللہ کا ایک قابل لحاظ پہلو ہے۔ عزت کے تحفظ کی خاطر لڑنا بھی جہاد فی سبیل اللہ کے زمرے میں آتا ہے۔ دفاعِ وطن اور آزادی کے لیے جدوجہد کرنی بھی جہاد فی سبیل اللہ کے دائرے میں شامل ہے۔ ارشاد نبوی ہے:

”جو شخص اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے مقتول ہوا، وہ شہید ہے۔ اور جو اپنے گھر والوں کو بچاتے ہوئے مقتول ہوا، وہ بھی شہید ہے۔ اور جو شخص اپنے دین کا دفاع کرتے ہوئے مقتول ہوا وہ بھی شہید ہے۔ اور جو شخص اپنی جان بچاتے ہوئے مقتول ہوا وہ بھی شہید ہے۔“[1]

یوں مسلمانوں نے انسانیت کو جو ابدی پیغام دینا چاہا تھا، اس کی حقیقت بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ جو مسلمانوں کے سفیر بن کر شاہِ فارس یزدگرد کے ہاں گئے تھے، انھوں نے بھی اسے یہی پیغام دیا تھا:

”اللہ نے ہمیں اس لیے بھیجا ہے کہ ہم لوگوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر اکیلے اللہ کی بندگی میں لے آئیں۔ انھیں دنیا کی بدحالی سے نکال کر دنیا کی خوشحالی میں لے آئیں۔ انھیں ادیان کے ظلم وستم سے نجات دلا کر رحمٰن کے عدل وانصاف کی طرف لے آئیں۔ اسلام کی نظر میں دنیا کی تمام قومیں برابر ہیں۔ رب تعالیٰ کی شریعت کے لحاظ سے تمام لوگ ایک جیسے ہیں۔ تمام انسان آدم کے بیٹے ہیں اور آدم مٹی سے پیدا ہوئے تھے۔“

[1] سنن النسائي، حديث: 4100.

فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ۚ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ﴾

''اے لوگو! ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے تخلیق کیا۔ اور تمھیں قومیں اور قبائل بنایا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ اللہ کے نزدیک تم میں سے سب سے مکرم وہ ہے جو تم میں سب سے متقی ہے۔''[1]

اسلام میں حقیقت تقویٰ کے صحیح ادراک ہی کا نتیجہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ اپنے سپہ سالاروں کو جنگ پر روانہ کرتے ہوئے یہ نصیحت فرمایا کرتے تھے:

''میں آپ کو اور آپ کے ہمراہیوں کو اللہ کے تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں۔''

وصیت تقویٰ کے بعد آپ یہ ہدایات دیا کرتے:

''اللہ کے نام پر لڑو۔ اس سے لڑو جو اللہ کا انکار کرتا ہے۔ خوب لڑنا اور مالِ غنیمت میں خیانت مت کرنا۔ عہد شکنی مت کرنا۔ مثلہ بھی مت کرنا۔ بچوں کو مت مارنا۔ دشمن سے آمنا سامنا ہو تو اسے تین باتوں کی طرف بلانا۔ ان تین باتوں میں سے وہ جو بات مان لے، اُسے تسلیم کر کے لڑائی سے ہاتھ کھینچ لینا۔ اگر وہ کوئی بات نہ مانے تو اللہ کی مدد چاہنا اور دشمن سے قتال کرنا۔''

سپہ سالار اور کمانڈر کے لیے تقویٰ اختیار کرنا بے حد ضروری ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ متقی کو اللہ کی پکڑ کا خوف ہوتا ہے۔ وہ اس کے مواخذے سے اور اس کے احتساب سے ڈرتا ہے۔ یوں وہ ہر معاملے میں عدل و انصاف سے کام لیتا اور اسی کی ترغیب دلاتا ہے۔

---

[1] الحجرات 13:49.

متقی دھوکا دہی سے بھی خائف رہتا ہے۔ وہ نہ دھوکا دیتا ہے نہ دھوکا کھاتا ہے۔ وہ خیانت بھی نہیں کرتا۔ وہ یقین رکھتا ہے کہ ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے۔ یوں بے چینی اور بے اطمینانی اس کے قریب نہیں پھٹکتی۔ وہ اس یقین کے ساتھ لڑتا ہے کہ اسے دو اچھی باتوں میں سے ایک بات تو ضرور میسر آئے گی۔ یا تو اسے فتح حاصل ہوگی یا پھر وہ شہادت سے سرفراز ہوگا۔

یہ بھی نہایت ضروری ہے کہ جنگ اللہ کے نام پر لڑی جائے۔ اسلام میں افراد کے نام پر، خاندانی و گروہی طرفداری کے نام پر یا مال غنیمت اور ناموری کے لیے جنگ نہیں لڑی جاتی۔

مسلمانوں کا یہ بھی شیوہ ہے کہ وہ جنگ کے ہنگاموں میں نہ تو مثلہ کرتے ہیں اور نہ بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کو قتل کرتے ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تعلیمات نبوی ہی کی روشنی میں اسلامی لشکر کو حسب ذیل ہدایات دی تھیں:

"کسی بچے، بوڑھے اور عورت کو قتل مت کرنا۔ کوئی درخت مت کاٹنا۔ سوائے کھانے کی ضرورت کے کوئی اونٹ، گائے اور بکری ذبح مت کرنا۔"

مسلمانوں کا طرز عمل یہ بھی ہے کہ وہ اللہ کے نام لیواؤں سے نہیں لڑتے۔ وہ صرف ان لوگوں کے خلاف ہتھیار اٹھاتے ہیں جو اللہ کے دین کو لوگوں تک نہیں پہنچنے دیتے۔ ان میں سے بھی وہ ان افراد سے لڑتے ہیں جو درج ذیل شرائط میں سے کوئی ایک شرط تسلیم نہیں کر لیتے:

اسلام قبول کرلو، یا جزیہ ادا کرو ورنہ لڑائی کے لیے تیار ہو جاؤ۔

اگر وہ اسلام قبول کر لیتے ہیں تو ان کے خلاف جنگ نہیں لڑی جاتی۔

ارشادِ ربانی ہے:

﴿ وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللهِ ﴾

”اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تُو بھی اُس کی طرف مائل ہو جا اور اللہ پر توکل کر۔“[1]

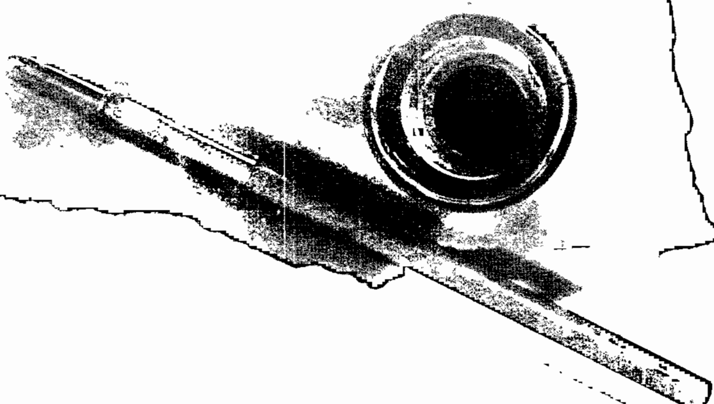
قبولِ اسلام کی صورت میں انھیں وہ تمام حقوق حاصل ہوتے ہیں جو دیگر مسلمانوں کو حاصل ہوتے ہیں اور وہ تمام فرائض ان پر بھی عائد ہوتے ہیں جو دیگر مسلمانوں پر عائد ہوتے ہیں۔ ہاں اگر وہ پہلی بات مسترد کرتے ہیں تو دوسری بات بہر صورت ماننی پڑتی ہے، یعنی وہ جزیہ ادا کریں۔ اہل ذمہ کے لیے جزیے کی حیثیت وہی ہے جو مسلمانوں کے لیے زکاۃ کی ہے۔ اہل ذمہ پر جزیہ عائد کرنے کی وجہ دراصل یہ ہے کہ اسلامی معاشرے کا ہر فرد اسلامی ریاست سے مالی تعاون کرتا ہے۔ یہ روپیہ مختلف اجتماعی معاملات کی انجام دہی کے سلسلے میں خرچ کیا جاتا ہے۔ زکاۃ ہر مال دار مسلمان پر فرض ہے۔ اہل ذمہ چونکہ اسلامی معاشرے کا حصہ ہوتے ہیں اور اسلامی ریاست کو ان کی فلاح و بہبود کے اخراجات بھی برداشت کرنے پڑتے ہیں، اس لیے قرین انصاف یہی ہے کہ وہ بھی اسلامی ریاست سے مالی تعاون کریں جو زکاۃ کے متبادل کے طور پر ان کے ذمے عائد کیا جاتا ہے۔ یوں اہل ذمہ کو اسلامی ریاست میں رہتے ہوئے جزیہ ادا کرنا پڑتا ہے۔

یہ تھا حرب وضرب کے تعلق سے اسلامی تعلیمات کا خلاصہ، یعنی غیر جانبدار انصاف۔ دوسروں کے حقوق کی پاسداری۔ نہ کوئی زبردستی نہ جبر و اکراہ۔

[1] الأنفال 61:8.

ABU UMAIMAH OWAIS

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ



حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے متعلق قرآن مجید کی آیات

ارشادِ ربانی ہے:

﴿ قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًاۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ۖ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ۝﴾

''کہہ دے ان لوگوں کو جو ایمان لائے کہ معاف کریں ان لوگوں کو جو امید نہیں رکھتے اللہ کے دنوں کی تا کہ وہ سزا دے ایک قوم کو اس کی جو وہ کسب کماتے تھے۔ جس نے عمل کیا صالح تو اپنے واسطے اور جس نے برائی کی تو اپنے حق میں، پھر تم اپنے رب ہی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔''[1]

اِن آیات کے متعلق مفسرین کے اقوال:

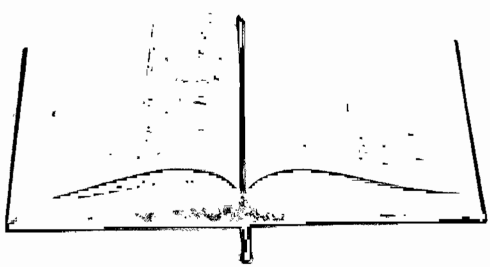
بعض اہلِ تفسیر جن میں قرطبی، بغوی، طبری اور واحدی جیسے ائمۂ تفسیر شامل ہیں، انھوں نے اپنی اپنی تفاسیر میں لکھا ہے کہ یہ آیات حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی تھیں۔[2]

[1] الجاثیة45:14,15. [2] دیکھیے: تفسير أحكام القرآن للقرطبي: 161/6، وتفسير البغوي: 127/6، وجامع البيان: 86/24، و أسباب نزول القرآن للواحدي، ص: 399.

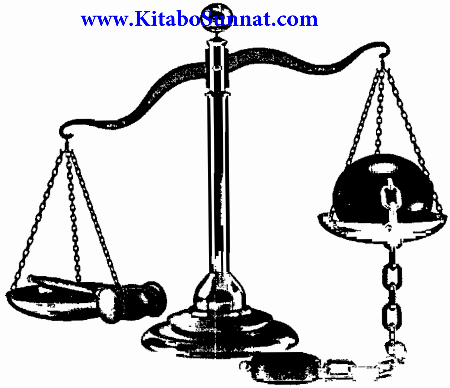
یہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کون ہیں؟

عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ وہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''میں سو رہا تھا کہ میں نے خود کو ایک کنویں پر دیکھا۔ کنویں پر ایک ڈول لٹکتا تھا۔ میں نے وہ ڈول لیا اور اس سے پانی کھینچا جتنا اللہ نے چاہا، پھر وہ ڈول ابن ابی قحافہ نے لیا اور ایک ڈول یا دو ڈول پانی کھینچا۔ ان کے پانی کھینچنے میں قدرے ضعیفی تھی۔ اللہ تعالیٰ انھیں معاف کرے۔ ان کے بعد عمر آئے۔ انھوں نے پانی کھینچا تو وہ ڈول، بڑے ڈول میں تبدیل ہو گیا۔ میں نے ایسا شاہ زور پہلوان نہیں دیکھا جو عمر کی طرح ڈول کھینچ سکتا۔ انھوں نے اتنا پانی کھینچا کہ سب لوگوں نے خوب سیر ہو کر پانی پی لیا اور اپنے اونٹوں کو سیراب کر کے ان کے باڑوں میں لے گئے۔''[1]



[1] صحيح البخاري، حديث: 3682,3664، وصحيح مسلم، حديث: 2392.



حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ

آدمیت کی کان سے نکلا ایک کامل آدمی جسے رسول اللہ ﷺ نے مکہ کی گھاٹیوں میں بھاگتے دوڑتے دیکھا تو تمنا کی کہ کاش اللہ تعالیٰ اِس آدمی کا دل اسلام کی روشنی سے منور کر دے۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا بھی فرمائی کہ بارے الٰہا! ابوجہل بن ہشام اور عمر بن خطاب میں سے جو تجھے محبوب ہے اُسے اسلام کی توفیق دے کر اسلام کو تقویت عطا فرما۔[1]

ایک ایسا بہادر جو بڑے بڑوں کے چھکے چھڑا دیتا اور عکاظ کے میلے میں عرب کے بڑے بڑے پہلوانوں کو پچھاڑ ڈالتا تھا۔ نہایت تقویٰ شعار اور عبادت گزار۔ ام ابان نے ایک مرتبہ اس کے متعلق کہا: ”وہ ایسا آدمی ہے جسے آخرت کی فکر نے دنیا کے افکار سے بیگانہ کر رکھا ہے، گویا وہ اپنے رب کو دونوں آنکھوں سے دیکھتا ہے۔“

عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے مکہ کی سنگلاخ وادی میں پرورش پائی تھی۔ وادی مکہ کی دہکتی فضا اور تیز دھوپ نے اس کی رنگت سنولا ڈالی تھی۔ اِس وادی کے آزاد ماحول، سخت پتھروں اور اونچے خشک پہاڑوں نے اُس کی جفاکشی کو خوب پروان چڑھایا تھا۔ وہ جوان ہوا اور بازوؤں میں دم آیا تو اس نے تیراندازی، نیزہ بازی اور گھڑسواری کے

[1] جامع الترمذي، حديث:3681.

فنون میں مہارت تامہ بہم پہنچائی۔ ان فنون میں کمال پیدا کرنا مکہ کے نوجوانوں کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا تھا۔

عمر کا والد خطاب نہایت تند خو اور سخت گیر آدمی تھا۔ عمر دن بھر خطاب کے اونٹ چراتا اور تھک کر بیٹھ جاتا تو خطاب اسے زد و کوب کرتا۔ خطاب کی سخت گیری عمر بھر اُس کی یادوں کا حصہ رہی۔ خطاب کٹر بت پرست تھا۔ چراگاہ کے اونٹ، صحرائے مکہ اور اصنامِ کعبہ، یہ تھی خطاب کی کل کائنات۔ وہ بڑے اہتمام سے بتوں کی پوجا کرتا، ان کی خوب آؤ بھگت کرتا، ان کی بھینٹ چڑھاتا۔ اس کے بھتیجے زید بن عمرو بن نفیل نے بتوں کی پوجا کرنی چھوڑ دی تھی۔ اب وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین حنیف کی تلاش میں مکہ سے نکل جانا چاہتا تھا۔ خطاب کو پتہ چلا تو اس نے صفیہ بنت حضرمی سے زید کی نگرانی کرنے کو کہا۔ زید جونہی رختِ سفر باندھ کر گھر سے نکل بھاگنے کی تیاری کرتا، صفیہ دوڑی ہوئی جاتی اور خطاب کو خبر کرتی۔ خطاب آتا، زید کو ڈراتا دھمکاتا اور جانے سے منع کر دیتا۔ اس نے جب دیکھا کہ زید ٹلنے کا نہیں تو اس نے زید کو حرا کے قریب مکہ کے پہاڑوں میں محبوس کر دیا اور قریش کے چند اوباشوں کو روانہ کیا کہ وہ زید کی نگرانی کریں اور یہ بھی دھیان رکھیں کہ وہ نہ تو سفر پر جانے پائے نہ مکہ میں داخل ہو سکے اور نہ لوگوں سے میل ملاپ کرنے پائے۔ مبادا وہ دوسرے لوگوں کی زندگی بھی خراب کر ڈالے۔[1]

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ایک بھائی زید بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ وہ بدر، اُحد، خندق سمیت تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ یمامہ میں لڑتے ہوئے مرتبہ شہادت

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام:149/1.

پر فائز ہوئے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو ان کے بچھڑنے کا بے حد غم تھا۔ آپ ہمیشہ کہا کرتے: ''جب بھی بادِ صبا چلتی ہے، مجھے زید کی خوشبو آتی ہے۔ وہ دو نیکیوں میں مجھ پر سبقت لے گیا۔ وہ مجھ سے پہلے اسلام لایا تھا اور مجھ سے پہلے شہید ہوا۔'' [1]

عمران عبدی کے والد کا بیان ہے کہ میں نے ایک روز عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی اقتدا میں صبح کی نماز ادا کی۔ نماز کے بعد وہ مسجد سے نکلنے لگے تو ایک پستہ قد آدمی سے ملاقات ہوئی جو ایک آنکھ سے کانا تھا۔ اس نے کمان کندھے پر لٹکا رکھی تھی۔ ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ یہ کون ہے؟ میں نے بتایا کہ یہ متمم بن نویرہ ہے۔ آپ نے اس سے فرمایا کہ ذرا وہ شعر تو سناؤ جو تم نے اپنے بھائی کے مرثیے میں کہے تھے۔ متمم بن نویرہ نے حسبِ ارشاد یہ شعر پڑھے:

وَكُنَّا كَنَدْمَانَي جُذَيْمَةَ حِقْبَةً

مِنَ الدَّهْرِ، حَتّٰى قِيلَ لَنْ يَتَصَدَّعَا

''ہم دونوں عرصے تک جذیمہ کے دو ہم مشرب ساتھیوں کی طرح اکٹھے رہے، کچھ اس طرح کہ لوگوں نے کہا یہ دونوں کبھی جدا نہیں ہوں گے۔''

فَلَمَّا تَفَرَّقْنَا كَأَنِّي وَمَالِكًا

لِطُولِ اجْتِمَاعٍ لَمْ نَبِتْ لَيْلًا مَعَا

''لیکن جب ہم جدا ہوئے تو مدتِ دراز ساتھ ساتھ رہنے کے باوجود یوں معلوم ہوتا تھا کہ میں اور مالک کبھی ایک دن کے لیے بھی اکٹھے نہیں رہے۔''

عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ تو جھوم اٹھے۔ فرمایا: بخدا مرثیہ تو اِسے کہتے ہیں، پھر کہنے لگے

[1] الاستيعاب في معرفة الأصحاب:553/2.

اللہ تعالیٰ زید بن خطاب رضی اللہ عنہ پر رحم فرمائے، اگر میں شعر کہنے پر قادر ہوتا تو جس طرح تم نے اپنے بھائی کا مرثیہ کہا ہے، میں بھی اس کا مرثیہ کہتا۔ معلوم ہوتا ہے، تم نے اپنے بھائی کا بہت غم کھایا ہے۔

متمم بولا اجی! پوچھیے ہی نہیں۔ اتنا رویا ہوں، اتنا رویا ہوں کہ کوئی کیا رویا ہوگا۔ یہ آنکھ جو آپ کو کانی دکھائی دیتی ہے، اچھی بھلی تھی۔ روتے روتے چلی گئی۔ جب یہ چلی گئی تو جو سلامت بچی، اس سے آنسو بہائے۔ اتنے آنسو بہائے کہ جو آنکھ چلی گئی تھی وہ بھی دوسری آنکھ کی مدد کرنے اور رونے لگی۔

عمر بن خطاب نے متعجب ہو کر فرمایا بھئی واقعی! یہ تو بڑا ہی شدید غم ہے۔ کسی نے اپنے مرنے والے کا ایسا غم کیونکر کھایا ہوگا۔

متمم نے کہا جی ہاں لیکن ایک بات میری بھی سن لیجیے۔ آپ کے بھائی کی طرح میرا بھائی یمامہ کی جنگ میں شہید ہوتا تو میں اس کے لیے کبھی نہ روتا۔

امیر المومنین کو اس کی یہ بات نہایت بھلی معلوم ہوئی۔ دل کو بے حد تسلی ملی۔ فرمایا: جیسی اچھی تسلی تم نے دی ہے، آج تک کسی نے نہیں دی۔ [1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایک فرزند حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ تھے۔ نہایت نیک طبع اور بہت عبادت گزار۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے متعلق ایک مرتبہ ان کی بہن ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ تمھارا بھائی عبداللہ اچھا آدمی ہے۔ کاش! وہ تہجد کی نماز پڑھا کرے۔ [2] کہتے ہیں کہ اس کے بعد حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کبھی تہجد کی نماز نہیں چھوڑی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلیہ محترمہ ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا، حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ

[1] الاستيعاب في معرفة الأصحاب: 553/2. [2] صحيح البخاري، حديث: 1122.

کی دختر تھیں۔ بڑی عابدہ و زاہدہ خاتون تھیں۔ ان کے متعلق حضرت جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بطورِ خاص بتایا تھا کہ وہ اہل جنت میں سے ہیں۔ [1]

جاہلیت کا عمر بن خطاب شہرِ مکہ کا باسی تھا۔ بطحائے مکہ ہی اس کے لیے سب کچھ تھا۔ وہ مکہ کے گرد و نواح میں دن دن بھر خطاب کے اونٹ اور اپنے بعض اقارب کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔ وہ پینے پلانے کا شغل بھی رکھتا اور جم کر پیتا تھا۔ مکہ کے دیگر نوجوانوں کی طرح وہ بھی عکاظ کے میلے میں بڑھ چڑھ کر شریک ہوتا۔ شہ زور ہونے کے ناتے عکاظ کے دنگل میں خم ٹھونکتا اور بڑے بڑے پہلوانوں سے پنجہ لڑاتا۔ پڑھا لکھا تھا اور شعر و شاعری کے ذوق سے آشنا۔ عکاظ میں شعر و شاعری کی جو محفلیں آراستہ ہوتیں، ان میں شرکت کرتا اور نہایت توجہ سے شعر سنتا۔ یوں اُس کی زندگی اور زندگی کی تمام سرگرمیاں مکہ کے دیگر باسیوں کے مقابلے میں مختلف نہیں تھیں۔

اسلام کے زیر سایہ

عمر بن خطاب نے اسلام کیونکر قبول کیا اور اسلام ان کے دل میں کیسے جاگزیں ہوا، آئیے یہ ماجرا خود ان کی زبانی سنتے ہیں۔ ان کا بیان ہے:

> ”میں اسلام سے بہت دور تھا۔ اسے قریب نہیں آنے دیتا تھا۔ جاہلیت میں جم کر شراب پیا کرتا تھا۔ شراب سے مجھے بڑا پیار تھا اور میں پی کر پھولے نہ سماتا تھا۔ ہماری بادہ خوری کی محفل میں قریش کے نامی سردار شریک ہوتے تھے۔ ایک رات یہی ارادہ کر کے گھر سے نکلا کہ چل کے دوستوں میں بیٹھتے اور ذرا پیتے پلاتے ہیں۔ اس جگہ پہنچا جہاں ہماری محفل جمتی تھی۔ آج کوئی دوست نہیں آیا

[1] صحيح الجامع، حديث:4351.

تھا۔ میں بھی چل دیا۔ سوچا مے کدے میں جاتا اور شوق پورا کرتا ہوں۔ وہاں پہنچا تو مے کدہ بھی ویران پڑا تھا۔ پینے پلانے کو کچھ نہیں تھا۔ دل میں آیا چلو آج مے کدہ نہیں تو مسجد ہی سہی۔ کعبہ چلتے اور طواف کرتے ہیں، چنانچہ مسجد میں پہنچا۔ طواف کرنا چاہتا تھا کہ ایک جگہ رسول اللہ ﷺ کھڑے دکھائی دیے۔ نماز پڑھ رہے تھے۔ معمول تھا کہ نماز پڑھتے تو شام کی طرف منہ کرتے۔ کعبہ آپ کے اور شام کے درمیان ہوتا۔ جائے نماز حجر اسود اور رکنِ یمانی کے بیچ تھی۔ دل میں کہا آج سنتا ہوں ذرا کہ محمد کیا پڑھتے رہتے ہیں۔ قریب ہو کر سنتا ہوں۔ مجھے دیکھیں گے تو گھبرا اٹھیں گے۔ میں حطیم کی جانب سے گیا اور غلافِ کعبہ میں چھپ کر دبے پاؤں آگے بڑھنے لگا۔ رسول اللہ ﷺ نماز میں کھڑے قرآن مجید کی تلاوت کرتے تھے۔ میں غلافِ کعبہ کی اوٹ میں چلتا ہوا بالکل روبرو آ گیا۔ اب میرے اور رسول اللہ ﷺ کے بیچ صرف غلافِ کعبہ تھا۔ میں نے قرآن کی تلاوت سنی تو دل نرم پڑ گیا اور میں رو دیا۔ اسلام نے میرے دل میں جگہ بنالی۔"[11]

قرآن مجید کی آیات سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دل آخر کیونکر نرم نہ پڑتا۔ وہ تو بڑے صاحبِ ذوق اور فصیح و بلیغ آدمی تھے۔ زبان و بیان کی نزاکتوں سے بخوبی آگاہ تھے۔ اچھا اسلوب بیان انھیں متأثر کیے بنا نہیں رہتا تھا، پھر یہ تو کلامِ الٰہی تھا جس کی فصاحت وبلاغت کے آگے عرب کے بڑے بڑے فصیحوں کی زبانیں گنگ تھیں۔ تلاوت بھی کیسی! خود رسول اللہ ﷺ کے پیارے اور مسحور کن لہجے میں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ

[11] السيرة النبوية لابن هشام:1/368.

کو تو متأثر ہونا ہی تھا۔ یہ وہ بابرکت لمحے تھے کہ عمر بن خطاب نے نیا جنم لیا۔ انھوں نے زندگی کے نئے اور انوکھے کارزار میں قدم رکھا۔ آیاتِ قرآنی نے ان کا دل پاکیزہ کر دیا اور ان کی کایا پلٹ ڈالی تھی۔ ان سے بھی پہلے قریش کے اصحاب سخن اور اساتذۂ کلام نے قرآنی آیات سن کر قرآن مجید کی معجز بیانی کا دم بھرا اور اس کی فصاحت و بلاغت کا لوہا مان کر اسلام قبول کیا تھا۔

مثال کے طور پر جاہلیت کے ممتاز شاعر لبید بن ربیعہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ لبید بن ربیعہ کا شمار دورِ جاہلیت کے سات بہترین شعرائے عرب میں ہوتا ہے۔ یہ سات شاعر سخن گوئی کے بلند ترین معیار پر پورے اترے تھے۔ دورِ جاہلیت میں مکہ کے قریب ہر سال عکاظ کا روایتی میلہ منعقد ہوتا تھا۔ عرب کے مانے ہوئے سخن ور اس میلے میں اپنا تازہ کلام لے کر آتے۔ شعر و شاعری کی محفلیں آراستہ ہوتیں۔ عرب کے ممتاز نقادانِ فن انجمن آرا ہوتے۔ شعرا کا کلام سنتے اور اُسے انتقادِ شعری کی کسوٹی پر رکھ کر پرکھتے۔ جس شاعر کا کلام مطلوبہ معیار پر پورا اترتا اسے زریں حروف میں لکھ کر باب کعبہ پر آویزاں کر دیا جاتا۔ ایسے قصائد مَعَلَّقَاتٌ کہلاتے۔ معلقات کی تخلیق کا اعزاز عرب کے بہت کم شاعروں کو حاصل ہوا۔ اس دور کے سات معلقات مشہور ہیں۔ ان میں ایک معلقہ لبید بن ربیعہ کی شاہکار تخلیق ہے۔ پرشکوہ الفاظ، پختہ اسلوب بیان، حکمت و دانائی اور نازک خیالی لبید کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ اس کی شاعری میں بدوی پندار اور کھرے پن کی جھلک واضح نظر آتی ہے۔

لبید نے لوگوں کی زبانی سنا کہ محمد نے دعویٰ کیا ہے، جو کلام وہ لے کر آیا ہے اس جیسا کلام عرب کا کوئی بڑے سے بڑا فصیح بھی تخلیق نہیں کر سکتا۔ اگر کسی میں دم ہے تو

میدان میں آئے۔ لبید نے اِس کے جواب میں چند شعر کہے اور کاغذ پر لکھ کر بابِ کعبہ پر آویزاں کر دیے۔ کسی مسلمان کی نظر پڑی تو اس نے طیش میں آکر چند آیات قرآنی کاغذ پر تحریر کیں اور ان شعروں کے برابر میں آویزاں کر ڈالیں۔ اگلے روز لبید حرمِ کعبہ میں آیا۔ اپنے کلام کے برابر میں لٹکتی آیات پڑھ کر حیران رہ گیا۔ وہ بول اٹھا کہ بخدا یہ کسی آدمی کا کلام نہیں۔ میں اس کے آگے سر جھکاتا ہوں۔ (میں مسلمان ہوتا ہوں۔) [1]

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے اسلام کے قریب آنے کا ایک باعث یہ بھی بنا کہ جب مسلمانوں نے مشرکین مکہ کی ایذا رسانیوں سے تنگ آکر حبشہ کی طرف ہجرت کی تو مہاجرینِ حبشہ میں وہ افراد بھی شامل تھے جن کا تعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دوست قبیلے سے تھا۔ انھیں دوستوں کی ہجرت سے سخت صدمہ پہنچا۔ انھوں نے سوچا کہ یہ افراد جس دین کی خاطر گھر بار چھوڑنے کو تیار ہو گئے ہیں وہ یقیناً سچا دین ہوگا۔

ام عبداللہ بن ابی حثمہ رضی اللہ عنہا بھی مہاجرین حبشہ میں شامل تھیں۔ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حلیف قبیلے سے تعلق رکھتی تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں سواری پر بیٹھے دیکھا تو پوچھا کہ کہاں کا ارادہ ہے۔ ام عبداللہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا کہ ہم گھر بار چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ تم نے ہم پر بہت ظلم ڈھایا ہے۔ ہم اللہ کی زمین میں نکل جائیں گے اور تب تک نہیں لوٹیں گے جب تک اللہ تعالیٰ کوئی اور راہ نہیں نکال دیتا۔ اتنا کہہ کر وہ چل دیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں خیر و عافیت کی دعا دی اور چلے آئے۔ بعدازاں ام عبداللہ رضی اللہ عنہا نے اپنے شوہر عامر سے اِس کا ذکر کیا اور خیال ظاہر کیا کہ شاید عمر بن خطاب کو ہمارا ہجرت کرنا اچھا نہیں لگا اور وہ پریشان ہوا ہے۔ عامر نے اُن سے کہا کہ شاید تم

---

[1] المذاهب المعاصرة و موقف الإسلام منها، ص: 146.

سمجھتی ہو، وہ اسلام قبول کرلے گا۔ انھوں نے جواب دیا کہ جی ہاں! مجھے تو یوں ہی معلوم ہوتا ہے۔ اس پر عامر نے کہا یہ تو ممکن ہے کہ خطاب کا گدھا اسلام لے آئے لیکن یہ ممکن نہیں کہ خطاب کا بیٹا مسلمان ہو جائے۔ [1]

لیکن ام عبداللہ کی بات سچ نکلی اور عمر بن خطاب نے اسلام قبول کرلیا۔ دورِ جاہلیت کا ایک دانش مند آدمی جسے اسلام نے کیا حاصل کیا، پوری انسانیت نے قیامت تک کے لیے اسے اپنا لیا۔ ایک خردمند روح جو ضائع ہونے کو تھی، اپنے بدن میں واپس آئی تو اسے اندھیرا اجالا الگ الگ دکھائی دینے لگا۔ اس نے نہ صرف پوری امت کو بلکہ پوری انسانیت کو فائدہ پہنچایا۔ اسلام کے لیے اُس نے ایسے ایسے کارنامے انجام دیے کہ رہتی دنیا تک یاد رکھے جائیں گے۔ دوسری اقوام نے اس کے کارہائے نمایاں دیکھے تو انگشت بدنداں رہ گئیں۔ انھوں نے دیکھا اور جانا کہ جب روحِ انسانی بالیدگی کی بلند سطح پر پہنچتی ہے تو کیسی کیسی مہمات سر کرتی اور کیسے کیسے طوفانوں سے ٹکراتی ہے۔ انھوں نے یہ بھی ملاحظہ کیا کہ عدل و انصاف اور حق پرستی زندگی کا مزاج کیسے بن جاتے ہیں۔ انھوں نے مشاہدہ کیا کہ گوشت پوست کا آدمی محض عدل و انصاف کا بول بالا کرنے کے لیے کیسے جیتا ہے۔ گویا وہ عدل و انصاف ہی کے لیے جاگتا اور سوتا ہے۔ گویا وہ ظلم وستم مٹانے کے لیے سانس لیتا ہے۔ گویا وہ عدل و انصاف کا مقروض ہے۔ عدل و انصاف اس سے قرض چکانے کا مطالبہ کر رہے ہیں اور وہ اس فکر میں گھل رہا ہے کہ اسے ہر حال میں یہ قرض چکانا ہے۔ [2]

آخر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اسلام لے آئے۔ اسلام لانے کے بعد انھوں نے

[1] الكامل لابن الأثير: 84/2. [2] موسوعة العقاد الإسلامية، ص: 385.

چاہا کہ دنیا کو علانیہ بتادیں کہ وہ مسلمان ہوگئے ہیں، چنانچہ قریش کی ایک محفل میں انھوں نے کسی سے پوچھا کہ مکہ کا کون آدمی ڈھنڈورا پیٹنے میں سب سے تیز ہے۔ جمیل بن معمر جمحی کا نام لیا گیا۔ وہ سیدھے جمیل کے ہاں پہنچے اور اسے بتایا کہ میں نے اسلام قبول کرلیا ہے۔ جمیل نے جونھی یہ بات سنی، اٹھ کھڑا ہوا۔ حرمِ کعبہ میں پہنچا اور بلند آواز سے پکارا: ''قریش کے لوگو! سن لو، عمر بن خطاب بے دین ہوگیا۔''

خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی اس کے پیچھے پیچھے حرم کعبہ میں گئے اور آپ نے بلند آواز سے کہا: ''یہ جھوٹ بولتا ہے۔ میں تو اسلام لایا ہوں۔ میں نے شہادت دی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔''

یہ اعلان سنتے ہی عتبہ بن ربیعہ ان کی طرف لپکا۔ وہ بھی ہوشیار کھڑے تھے۔ دونوں میں پنجہ آزمائی ہونے لگی۔ مضبوط و توانا عمر رضی اللہ عنہ نے عتبہ کو چاروں شانے چت کر ڈالا اور اس کے دیدوں میں انگلیاں گھسیڑ کر بولے:

''نکال دوں گا یہ دیدے کہ انھیں روشنی دکھائی نہیں دیتی۔''

یہ منظر دیکھ کر کئی اور لوگ آستینیں چڑھائے ان کی طرف بڑھے تاہم جو بھی ان کے قریب آیا، انھوں نے روئی کی طرح دھنک ڈالا۔ لڑتے بھڑتے خاصی دیر ہوگئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھک کر بیٹھ گئے۔ اہل قریش سر پر آ کھڑے ہوئے۔ انھیں برا بھلا کہنے لگے۔ فرمایا: ''جو جی میں آئے، کرو۔ بخدا! اگر ہم تین سو آدمی ہوتے تو مکہ میں یا ہم رہتے یا تم۔''[1]

اتنے میں قریش کا ایک معمر سردار ادھر آنکلا۔ وہ نہایت بیش قیمت، مرصع و منقش قمیص اور عمدہ یمنی چادر زیب تن کیے تھا۔ بولا: ''کیا بات ہے؟''

[1] أسد الغابة: 56/4، والسيرة النبوية لابن هشام: 219/1.

لوگوں نے کہا: ''عمر بے دین ہو گیا ہے۔''

''تو کیا ہوا؟!'' معمر سردار نے پختہ لہجے میں کہا۔ ایک آدمی نے اپنے لیے ایک بات پسند کی تو تمھارا کیا گیا؟! کیا سمجھتے ہو تم! بنو عدی اپنے آدمی کو یوں تمھارے حوالے کر دیں گے اور تم سے کچھ باز پُرس نہیں کریں گے؟! ہٹ جاؤ یہاں سے۔ چھوڑ دو اُسے۔''

بوڑھے سردار کے کہنے پر لوگوں کی بھیڑ یوں چھٹ گئی جیسے کوئی کپڑا تھا جسے یکبارگی کھینچ کر اتار دیا گیا۔ سردار کا نام تھا، عاص بن وائل سہمی۔ [1]

یہاں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سیدھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ عرض کیا یارسول اللہ! کیا ہم حق پر نہیں، چاہے مر جائیں، چاہے جیتے رہیں۔ فرمایا: ''کیوں نہیں! قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تم بلاشبہ حق پر ہو، زندہ رہو یا نہ رہو۔'' عرض کیا تو پھر چھپ کر رہنے کا کیا مطلب ہے۔ قسم اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا، ہم تو ضرور باہر نکلیں گے، چنانچہ رہروانِ جادۂ حق کی دو صفیں بن گئیں۔ ایک میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ جلوہ افروز ہوئے اور دوسری میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے جلو میں آگے بڑھے۔

بڑا دیدنی منظر تھا یہ۔ وہ جوش و جذبہ سے قدم اٹھاتے ہوئے حرم کعبہ میں داخل ہوئے۔ اہل قریش نے یہ منظر دیکھا تو ان کے چہروں پر مردنی چھا گئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے ہوتے ہوئے کسی ادنیٰ و اعلیٰ کو جرأت نہ ہوئی کہ ان کے قریب پھٹکے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس روز حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فاروق کا لقب دیا۔ فاروق جس

[1] السيرة النبوية لابن هشام:349/1.

نے حق و باطل میں فرق کر دکھایا تھا۔ ان کے متعلق ان کے دوست حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا کہنا تھا: ''جب عمر اسلام لائے، ہمارا اثر و رسوخ قائم ہوگیا۔[1] ان کا قبولِ اسلام (اسلام کی) فتح تھی۔ ان کی ہجرت (اللہ کی) نصرت اور ان کی خلافت (اللہ کی) رحمت تھی۔ جب تک عمر اسلام نہ لائے، ہم بیت اللہ میں کھلے عام نماز نہیں پڑھ سکتے تھے۔''[2]

حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ نے کہا تھا کہ جب عمر نے اسلام قبول کیا تو ہم بیت اللہ کے گرد بے روک ٹوک مجلسیں آراستہ کرنے لگے۔ تب ہم نے کھلے عام کعبہ کا طواف کیا اور جن لوگوں نے ہم پر ظلم کیا تھا، ان سے ہم نے انتقام لیا۔[3]

ہجرت مدینہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو اجازت دے دی کہ یثرب کی طرف ہجرت کر جائیں، چنانچہ جونہی رات کی تاریکی چھاتی، وہ دبے پاؤں مکہ سے نکلتے اور تیزی سے سفر کرتے ہوئے یثرب پہنچ جاتے۔ بعض افراد ٹولیوں کی شکل میں نکلتے اور بعض فرداً فرداً ہجرت کا یہ طویل سفر طے کرتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عیاش بن ابی ربیعہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ہشام بن العاص رضی اللہ عنہ سے یہ طے کیا کہ وہ تینوں ہجرت کا سفر اکٹھے طے کریں گے۔ آغاز سفر کے لیے مکہ سے دس میل دور واقع دیار بنی غفار کا انتخاب کیا گیا اور یہ طے پایا کہ تینوں وقت مقررہ پر وہاں پہنچیں گے۔ جو آدمی وہاں نہیں پہنچ پایا، باقی دونوں اس کا انتظار کیے بغیر سفر کا آغاز کریں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ

[1] صحيح البخاري، حديث: 3684. [2] تاريخ الخلفاء، ص: 45، و طبقات ابن سعد: 193/1.
[3] الرياض: 195/1، تفسير الخازن: 214/2.

اور حضرت عیاش بن ابی ربیعہ رضی اللہ عنہ تو وقت مقررہ پر وہاں جا پہنچے۔ حضرت ہشام رضی اللہ عنہ کو مکہ میں محبوس کر دیا گیا۔ وہ غزوۂ خندق کے بعد نجات پا کر مدینہ پہنچے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اُن کا انتظار کیے بغیر رفیق سفر حضرت عیاش بن ابی ربیعہ رضی اللہ عنہ کے ہمراہ سفر کا آغاز کیا اور یثرب پہنچ گئے۔ یثرب میں یہ دونوں مہاجر رفاعہ بن منذر کے ہاں ٹھہرے ہی تھے کہ ابوجہل اور حارث بھی وہاں پہنچ گئے۔ انھوں نے حضرت عیاش رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تمھارے آنے کے بعد تمھاری والدہ نے نذر مان لی ہے کہ جب تک تمھیں نہیں دیکھے گی، نہ تو سائے میں بیٹھے گی نہ سر کو خوشبو لگائے گی۔

حضرت عیاش رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مشورہ کیا۔ آپ نے فرمایا:

''واللہ! یہ تمھیں تمھارے دین سے ہٹانا چاہتا ہے، اس لیے ہوشیار رہو اور اس کی باتوں میں مت آؤ۔ تمھیں اس کے ساتھ نہیں جانا چاہیے۔ تمھاری ماں کو سر کی جوؤں نے ستایا تو وہ خود ہی کنگھی پٹی کر لے گی۔ مکہ کی تیز دھوپ سے تنگ آ کر سائے میں بھی بیٹھے گی۔''

حضرت عیاش رضی اللہ عنہ نے کہا: ''مکہ میں میرا کچھ روپیہ بھی رہ گیا ہے۔ شاید میں وہ روپیہ حاصل کرلوں اور وہ مسلمانوں کے کام آئے۔ یوں میں اپنی والدہ کی منت بھی پوری کرلوں گا۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''تم جانتے ہو کہ میرا شمار قریش کے مالدار افراد میں ہوتا ہے۔ میں اپنا آدھا روپیہ تمھیں دیتا ہوں لیکن ان کے ساتھ مت جاؤ۔''

حضرت عیاش رضی اللہ عنہ نے بہرصورت ان کے ہمراہ جانا چاہا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''کسی طرح نہیں ٹلتے تو میری اونٹنی لیتے جاؤ۔ بڑی عمدہ اور جم کر چلنے والی اونٹنی ہے۔

اس پر سوار رہنا۔ ان لوگوں کی نیت میں فتور نظر آئے تو اونٹنی بھگا لینا۔"

حضرت عیاش رضی اللہ عنہ اطمینان سے ان کے ساتھ چلے آئے۔ راستے میں جب وہ جبل صجنان پر پہنچے تو مکار ابوجہل نے حضرت عیاش رضی اللہ عنہ سے کہا: "میرے بھائی! میرا اونٹ تو بڑا سخت ہے۔ تم مجھے اپنی اونٹنی پر بٹھا لو۔"

حضرت عیاش رضی اللہ عنہ نے فوراً کہا: "ہاں، ہاں۔ کیوں نہیں۔"

یہ کہہ کر اُنھوں نے اونٹنی کو فوراً بٹھا دیا اور زمین پر اتر آئے۔ وہ دونوں اپنی اپنی سواریوں سے اترے، حضرت عیاش رضی اللہ عنہ کی طرف لپکے اور انُ کی مشکیں کس دیں۔ اُنھیں اسی حالت میں ساتھ لیے مکہ پہنچے اور لوگوں سے کہنے لگے:

"اہلِ مکہ! اپنے اپنے احمقوں پر یہی داؤ آزماؤ جو ہم نے آزمایا۔" پھر انھوں نے حضرت عیاش رضی اللہ عنہ کو قید خانے میں ڈال دیا۔ [61]

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ جہاں تک میں جانتا ہوں، عمر بن خطاب کے سوا تمام مہاجرین نے دبے پاؤں ہجرت کی تھی۔ عمر بن خطاب نے جب ہجرت کے لیے رختِ سفر باندھا تو تلوار اٹھائی، کمان کندھے پر رکھی، ترکش میں سے چند تیر نکال کر ہاتھ میں لیے اور حرمِ کعبہ میں گئے۔ قریش کے سردار معمول کی مجلسوں میں بیٹھے تھے۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے دھڑلے سے بیت اللہ کا طواف کیا۔ سات پھیرے لگا کر مقامِ ابراہیم پر آئے اور نماز پڑھی، پھر فرداً فرداً سردارانِ قریش کی تمام ٹولیوں میں کھڑے ہو کر بآوازِ بلند کہا: "یہ چہرے بدنما ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ انھی چہروں کو رسوا کرے۔ جو آدمی اپنی ماں کو بے اولاد، اپنی اولاد کو یتیم اور اپنی بیوی کو بیوہ کرنا چاہے وہ وادی کی دوسری طرف مجھ سے ملاقات کر لے۔"

---

[61] طبقات ابن سعد:194/1، والسیرة النبویة لابن هشام:288/1.

چند بے بس اور کمزور مسلمان ہی ان کے پیچھے گئے۔ عمر بن خطاب نے انھیں ضروری ہدایات دیں۔ انھیں بتایا کہ وہ کافروں کے چنگل سے کیونکر نکل سکتے ہیں، پھر وہ یثرب کی راہ پر گامزن ہو گئے۔ [1]

عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ میں

مدینہ منورہ میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اسلام کے جانباز سپاہی بن کر زندگی گزارتے رہے۔ وہ حلقۂ یاراں میں بیٹھتے تو بریشم کی طرح نرم ہوتے۔ رزمِ حق و باطل میں خدا کے دشمنوں سے ٹکراتے تو فولاد کی مانند سخت اور ناقابلِ شکست ہوتے۔ بڑے دانش مند اور سمجھدار آدمی تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اہم معاملات میں ان کی رائے ضرور لیتے اور ان کا مشورہ اکثر قبول فرماتے۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ جو رائے دیتے، اس کی تائید میں قرآنی آیات نازل ہوتیں۔

معرکۂ بدر اختتام کو پہنچا تو نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر، حضرت علی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہم سے رائے طلب کی کہ بدر کے قیدیوں سے کیا سلوک کرنا چاہیے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے نبی! یہ قیدی ہمارے عم زاد، اہلِ خاندان اور ہمارے بھائی بند ہی تو ہیں۔ میری رائے اس سلسلے میں یہ ہے کہ ہم ان سے فدیہ لے کر انھیں آزاد کر دیں۔ فدیے کی رقم ہمارے کام آئے گی اور بہت ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں ہدایت دے دے اور یہ ہمارے دست و بازو بن جائیں۔

ان کی رائے سن کر آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف دیکھا اور فرمایا:

''ابن خطاب! آپ کی کیا رائے ہے؟''

[1] الرياض النضرة، وأسدالغابة: 58/4.

انھوں نے جواب دیا: ''نہیں، اللہ کی قسم! میری رائے وہ نہیں جو ابوبکر نے ظاہر کی ہے۔ میری رائے تو ان قیدیوں کے متعلق یہ ہے کہ مجھے فلاں قیدی پر اختیار دیجیے تو میں اس کی گردن مار ڈالوں۔ عباس کو حمزہ کے سپرد کیجیے، وہ اس کی گردن اڑا دیں۔ عقیل کو علی کے حوالے کیجیے کہ وہ اس کا سر تن سے جدا کر ڈالیں تا کہ پتہ چل جائے کہ کافروں کے لیے ہمارے دل میں کوئی نرم گوشہ نہیں۔ یہ سب کافروں کے سردار اور ان کے قائدین ہیں۔''

رسول اللہ ﷺ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے پسند آئی اور آپ نے اسی کے موافق فیصلہ کیا۔ [1]

اگلی صبح حضرت عمر رضی اللہ عنہ خدمت نبوی میں حاضر ہوئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی حاضر خدمت تھے۔ نبی کریم ﷺ اور وہ دونوں بیٹھے رو رہے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ منظر دیکھ کر گھبرا اٹھے۔ عرض کیا: ''یارسول اللہ! مجھے بتائیے، آپ دونوں کیوں رو رہے ہیں۔ اگر رونے کی بات ہے تو میں بھی رووں ورنہ آپ کو روتا دیکھ کر ہی آنسو بہاؤں۔''

فرمایا: ''تمھارے ساتھیوں نے یہ رائے دی تھی کہ فدیہ لے کر قیدیوں کو آزاد کردوں، وہی بات رلاتی ہے۔ اس کی وجہ سے مجھے عذاب دکھایا گیا ہے، اس درخت سے بھی زیادہ قریب کر کے۔''

اللہ تعالیٰ نے فدیہ لے کر قیدیوں کو آزاد کرنے کے متعلق یہ آیات نازل فرمائی تھیں:

﴿مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ أَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ ۚ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۗ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ○﴾

---

[1] تاريخ الطبري: 2/294.

''کسی نبی کے لائق نہیں کہ اس کے پاس قیدی ہوں یہاں تک کہ وہ زمین پر خوب خونریزی کرلے۔ تم سامانِ دنیا کا ارادہ کرتے ہو اور اللہ آخرت کا ارادہ کرتا ہے۔ اور اللہ نہایت غالب، خوب حکمت والا ہے۔ اگر اللہ کی طرف سے (ایک بات) پہلے لکھی ہوئی نہ ہوتی تو تمھیں اس کے بدلے میں جو تم نے لیا، بہت بڑا عذاب پہنچتا۔''[1]

یوں قرآنِ مجید نے اس سلسلے میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی تائید کی۔ بدر کے قیدیوں کے متعلق تو ان کی یہ رائے تھی کہ انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا جائے، تاہم بدر کے ایک اسیر سردار سہیل بن عمرو کے بارے میں بھی ان کا مشورہ یہ تھا کہ اس کے سامنے کے دانت نکال دیے جائیں تاکہ جب بھی بولے، زبان پھسل جائے۔ یوں وہ کبھی ایسی تقریر نہیں کر پائے گا جسے مسلمان ناپسند کریں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں۔ میں اس کا مثلہ نہیں کروں گا ورنہ اللہ میرا بھی مثلہ کرے گا، ہر چند میں نبی ہی ہوں۔ آپ نے مزید فرمایا کہ عین ممکن ہے، کبھی وہ ایسی بھی تقریر کرے جو آپ کو ناگوار نہ گزرے۔

آپ کی یہ پیش گوئی پوری ہوئی۔ وفاتِ نبوی کے بعد جب اہل مکہ نے جادۂ اسلام سے انحراف کرنے کا ارادہ کرلیا اور حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ جو نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مکہ کے والی تھے، وہ ان کے ڈر کے مارے چھپ گئے تو حضرت سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہ نے اہل مکہ سے خطاب کیا۔ حمد و ثنا کے بعد انھوں نے وفاتِ نبوی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اسلام کمزور نہیں پڑے گا۔ جس آدمی کے متعلق ہمیں شک گزرا کہ وہ اسلام سے منحرف ہونے کے لیے پَر تول رہا ہے، ہم اس کی گردن مار ڈالیں گے۔

[1] الأنفال 8:67,68.

یوں جو افراد مکہ میں ارتداد کا فتنہ برپا کرنا چاہتے تھے، وہ اپنے ارادے سے باز آ گئے۔ حضرت سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہ کی یہی وہ تقریر تھی جس کا ذکر نبیِ کریم ﷺ نے اپنی پیش گوئی میں کیا تھا۔[1]

خواتین سے بیعت لینے کا مرحلہ آیا تو نبیِ کریم نے اِس سلسلے میں معاونت کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا انتخاب کیا۔ چند خواتین بیعت کرنے کے لیے خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئیں۔ اُنھی میں ہند بنت عتبہ رضی اللہ عنہا بھی تھی جو بھیس بدل کر آئی تھی۔ نبی کریم ﷺ نے اُن سے بیعت لیتے ہوئے فرمایا:

"مجھ سے اِس امر کی بیعت کریے کہ آپ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گی۔"

ہند بنت عتبہ کی شوخیِ طبع معلوم ہے۔ اس نے تنک کر کہا:

"واللہ! آپ ہم سے ان باتوں کی بیعت لے رہے ہیں جن کی بیعت آپ نے مردوں سے نہیں لی۔"

آپ نے مزید فرمایا: "اور اِس امر کی بھی بیعت کیجیے کہ آپ چوری چکاری نہیں کریں گی۔"

ہند بنت عتبہ نے کہا: "واللہ! میں تو گاہے گاہے ابوسفیان کا کچھ روپیہ اڑاتی رہی ہوں۔ اب یہ مجھے نہیں معلوم کہ وہ میرے لیے حلال تھا یا نہیں۔"

ہند کے شوہر حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ بھی موقع پر موجود تھے۔ وہ ہند کی باتیں سن رہے تھے۔ انھوں نے ہند سے کہا: "آج سے پہلے میرا جتنا روپیہ تم نے اڑایا ہے وہ میں تمھیں معاف کرتا ہوں۔"

[1] الکامل لابن الأثیر 2/253,252.

نبیِ کریم ﷺ کو یہ جان کر قدرے حیرت ہوئی کہ جن خواتین سے وہ بیعت لے رہے ہیں، انھی میں ہند بنت عتبہ بھی شامل ہے اور وہی ہر مرتبہ بول اٹھتی ہے۔ آپ نے فرمایا: ''تو کیا تم ہند بنت عتبہ ہو؟''

وہ بولی: ''میں ہند بنت عتبہ ہوں۔ ماضی میں جو ہوا سو ہوا۔ اس کے متعلق آپ مجھے معاف کر دیجیے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو معاف فرمائے۔''

آپ نے مزید فرمایا کہ اس بات کی بھی بیعت کیجیے کہ آپ زنا نہیں کریں گی۔

ہند بنت عتبہ نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! آزاد عورت بھی کہیں زنا کرتی ہے؟!''

آپ نے فرمایا: ''اور اِس امر کی بھی بیعت کریے کہ آپ اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گی۔''

ہند بنت عتبہ کہنے لگی: ''اولاد جب چھوٹی تھی، ہم نے اسے پالا پوسا۔ بڑی ہوئی تو آپ نے یومِ بدر کو اس کا کام تمام کر ڈالا۔''

ہند کی اس بات پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کھلکھلا کر ہنس دیے۔ آپ نے مزید فرمایا: ''اور اِس امر کی بھی بیعت کریے کہ آپ بہتان نہیں باندھیں گی۔''

ہند بنت عتبہ نے کہا: ''بہتان باندھنا تو واللہ بہت بُری بات ہے۔'' آپ نے مزید فرمایا: ''اِس کی بھی بیعت کر لیجیے کہ آپ امرِ جائز میں میری مخالفت نہیں کریں گی۔''

وہ بولی: ''امرِ جائز میں آپ کی نافرمانی کرنے کا ارادہ ہوتا تو آپ کی خدمت میں آتی ہی کیوں!''

بیعت کی کارروائی پوری ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے بیعت کرنے والی خواتین کے لیے دعائے مغفرت فرمائی۔ [1]

---

[1] تاريخ الطبري: 121/3.

اکثر ایسا ہوتا کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو جو امر اسلام اور مسلمانوں کے حق میں بہتر معلوم ہوتا، حضور نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کرتے۔ آپ گاہے ان کی بات تسلیم کرتے اور اس امر کا نفاذ کر ڈالتے اور گاہے مسترد کر دیتے۔

ایک مرتبہ انھوں نے خدمت نبوی میں عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! اپنی ازواج کو پردہ کرایا کیجیے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بقول آپ نے ان کا یہ مشورہ قبول نہیں کیا۔ ازواج مطہرات رات کے وقت قضائے حاجت کے لیے مدینہ کے باہر کھلی جگہ جایا کرتی تھیں۔ ایک رات حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا قضائے حاجت کے لیے گھر سے نکلیں۔ وہ طویل القامت خاتون تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ معمول کی مجلس میں بیٹھے تھے۔ انھیں دیکھتے ہی بولے: ''سودہ! ہم نے آپ کو پہچان لیا۔''[1]

اِس پر اللہ تعالیٰ نے آیت حجاب نازل فرمائی۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خدمت نبوی میں عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! اگر آپ ازواج مطہرات کو پردے میں رکھیں تو کیا یہ اچھا نہیں ہوگا! کیونکہ نیک و بد ہر طرح کے افراد کو ان سے بات چیت کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس پر آیت حجاب نازل ہوئی۔[2]

حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کا بیان ہے: ''عمر نے ازواجِ نبوی کو حکم دیا کہ وہ پردے میں رہا کریں۔ ام المومنین زینب رضی اللہ عنہا نے ان سے کہا: ''ابن خطاب! تم ہم پر حکم چلاتے ہو؟!

ہم پر!! جن کے گھروں میں وحی اترتی ہے؟!

[1] صحيح البخاري، حديث: 146. [2] صحيح البخاري، حديث: 402.

اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿ وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوهُنَّ مِن وَرَآءِ حِجَابٍ ﴾

''اور جب تم ان (ازواج مطہرات) سے کوئی چیز مانگو تو پردے کے پیچھے سے مانگو۔'' [1]

رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی مرا تو نبیِ کریم ﷺ سے عرض کیا گیا کہ تشریف لائیے اور ابن ابی کی نماز جنازہ پڑھا دیجیے۔ آپ تشریف لے گئے اور نمازِ جنازہ کے لیے کھڑے ہی ہوئے تھے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور روبرو آ کر عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! کیا آپ اللہ کے دشمن عبداللہ بن ابی کے لیے دعائے مغفرت کریں گے جس نے فلاں روز فلاں گھٹیا بات کہی تھی اور فلاں دن فلاں بکواس کی تھی!''

وہ عبداللہ بن ابی کی زبان درازیاں گنواتے رہے اور رسول اللہ ﷺ کھڑے مسکراتے رہے۔ انھوں نے باصرار کہا تو آپ نے فرمایا: ''عمر! پیچھے ہٹ جائیے۔ مجھے دو باتوں کا اختیار دیا گیا ہے۔ اور میں نے ان میں سے ایک بات اختیار کر لی ہے۔ مجھ سے فرمایا گیا ہے:

﴿ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ﴾

''تم ان (منافقین) کے لیے مغفرت کی دعا کرو یا ان کے لیے مغفرت کی دعا نہ کرو۔ اگر تم ان کے لیے ستر مرتبہ مغفرت کی دعا کرو گے تو بھی اللہ کبھی ان کی مغفرت نہیں کرے گا۔'' [2]

---

[1] الأحزاب 53:33. [2] التوبة 80:9.

اگر مجھے پتہ ہوتا کہ میں ستر سے زائد مرتبہ دعائے مغفرت کروں گا تو ان کی مغفرت کر دی جائے گی تو میں ان کے لیے ستر سے بھی زائد مرتبہ دعائے مغفرت کرتا۔'' پھر آپ نے اس کی نماز جنازہ پڑھائی، جنازے کے ہمراہ گئے اور تدفین تک وہیں ٹھہرے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ مجھے خود پر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو اپنی جرأتِ کلام پر بڑی حیرت ہوئی۔ بعدازاں تھوڑے ہی عرصے میں یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ وَلَا تُصَلِّ عَلَىٰٓ أَحَدٍ مِّنْهُم مَّاتَ أَبَدًا وَلَا تَقُمْ عَلَىٰ قَبْرِهِۦٓ ﴾

''ان (منافقین) میں سے جو بھی مرجائے، تم کبھی اس کی نماز جنازہ مت پڑھنا نہ اس کی قبر پر ٹھہرنا۔''[1]

چنانچہ ابن ابی کے بعد نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ تو کسی منافق کی نمازِ جنازہ پڑھی نہ اس کی قبر پر ٹھہرے۔

یہ تھے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جن کے متعلق عہدِ نبوی کی ایک خاتون نے کہا تھا:

''وہ تو گویا رب تعالیٰ کو دونوں آنکھوں سے دیکھتا ہے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعلق فرمایا تھا:

''اللہ تعالیٰ نے عمر کی زبان پر حق جاری کر دیا اور اس کے دل میں حق کا القا کر دیا ہے۔''[2]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعلق یہ بھی فرمایا تھا: ''اگلی امتوں میں ایسے افراد ہو گزرے ہیں جنھیں الہام ہوتا تھا۔ میری امت میں اگر ایسا کوئی فرد ہے تو وہ عمر بن خطاب ہے۔''[3]

[1] التوبة 9:84. [2] سنن أبي داود، حديث:2962. [3] صحيح البخاري، حديث:3689.

رسول اللہ ﷺ نے وفات پائی تو مسلمانوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو آپ کا خلیفہ منتخب کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفۂ رسول کے معاون و مددگار کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ انھوں نے خود اپنے متعلق بتایا:

''میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ان کے خادم کی حیثیت سے رہتا تھا۔ ان کی نرم مزاجی اور رحم دلی کے کیا کہنے! کوئی آدمی اتنا نرم مزاج اور رحمدل نہیں ہوسکتا۔ وہ تو جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، اہلِ ایمان کے لیے بڑے ہی مشفق اور نہایت درجہ مہربان تھے۔ میں تو ان کی خدمت میں ننگی تلوار کی طرح رہتا تھا۔ چاہتے تو میان میں ڈال لیتے۔ چاہتے تو چھوڑ دیتے اور تلوار اپنا کام کرتی۔ رسول اللہ ﷺ کی خدمت عالیہ میں جب تک رہا اِسی حیثیت سے رہا۔ جب آپ نے وفات پائی تو اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آپ مجھ سے راضی تھے۔ میں اِسے اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں۔ بعدازاں ابوبکر مسلمانوں کے والی بنے۔ وہ جیسے آدمی ہیں، سب کو پتہ ہے۔ نہایت نرم دل، اچھے اور دھیمے مزاج کے۔ میں ان کا بھی خادم اور معاون تھا۔ اپنی سخت گیری کو ان کی نرم مزاجی سے ملاتا۔ ان کی خدمت میں بھی میں ننگی تلوار کی طرح رہتا تھا۔ چاہتے تو میان میں ڈال لیتے۔ چاہتے تو چھوڑ دیتے اور تلوار اپنا کام کرتی۔''[1]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت بہت مختصر تھا۔ خود رسول اللہ ﷺ نے اس کی پیش گوئی کی تھی۔ آپ نے ایک دفعہ فرمایا تھا:

''میں نے خواب میں دیکھا کہ میں ایک ڈول کی مدد سے کنویں میں سے پانی

[1] كتاب الخراج لأبي يوسف، ص: 160.

نکال رہا ہوں۔ میرے بعد ابوبکر آئے اور ناتوانی سے ایک یا دو ڈول پانی نکالا۔ اللہ انھیں معاف فرمائے، پھر عمر بن خطاب آئے تو وہ ڈول بڑی بالٹی میں تبدیل ہوگیا۔ میں نے ایسا باکمال آدمی نہیں دیکھا جس نے ان جیسا حیرت انگیز کام کر دکھایا ہو۔ انھوں نے اتنا پانی کھینچا کہ لوگوں نے خوب سیر ہو کر پانی پیا اور اونٹوں کو خوب سیراب کیا۔''[1]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ صاحبِ فراش ہوئے اور بیماری نے شدت اختیار کی تو انھیں خدشہ لاحق ہوا کہ مبادا وہ مسلمانوں کو نئے خلیفہ کی سرپرستی میں دیے بغیر چھوڑ جائیں۔ انھوں نے جان لیوا بیماری کی مطلق پروا نہ کی۔ مسلمانوں کو بلایا، اپنی معزولی کا اعلان کیا اور کہا کہ بارِ خلافت اٹھانے کے لیے کسی اور کو منتخب کر لیجیے۔ انھوں نے فرمایا: ''مجھ پر جو کیفیت (بیماری کی) طاری ہے وہ تو آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔ مجھے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ اسی بیماری میں مر جاؤں گا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے عہد و پیمان کو میری فصیلِ بیعت سے آزاد کر دیا اور آپ پر سے میری گرہ کھول ڈالی ہے۔ اس نے آپ کا امرِ حکومت آپ کو لوٹا دیا ہے، اس لیے جو آدمی آپ کو پسند آئے، اسے اپنا امیر بنا لیجیے۔''

لوگ گئے۔ مشاورت کی۔ جستجو کی لیکن کسی ایک پر اتفاق نہ کر پائے۔ خلیفۂ رسول کی خدمت میں واپس آئے اور عرض کیا کہ آپ ہی نئے خلیفہ کا انتخاب کر دیجیے۔ فرمایا: ''بہت اچھا، مجھے تھوڑی مہلت دیجیے تاکہ میں دیکھوں کہ اللہ کی مرضی کیا ہے، دین کے لیے کیا بہتر اور بندگانِ خدا کے لیے کیا سودمند ہے۔''

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو بلا بھیجا۔ وہ تشریف لائے تو فرمایا: ''عمر بن خطاب کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟''

---

[1] صحيح البخاري، حديث:3664-3682.

وہ کہنے لگے: ''آپ مجھ سے جس امر کے متعلق پوچھ رہے ہیں اسے آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔''

فرمایا: ''پھر بھی، کچھ تو کہیے۔''

وہ بولے: ''آپ انھیں جیسا سمجھتے ہیں وہ اس سے بھی کچھ بڑھ کر ہیں۔''

پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بلا بھیجا۔ وہ تشریف لائے تو ان سے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کے متعلق پوچھا۔ انھوں نے کہا: ''جہاں تک میں جانتا ہوں، ان کا باطن ان کے ظاہر سے بہتر ہے اور ہم میں ان کی سی قابلیت کا کوئی آدمی نہیں۔''

فرمایا: ''اللہ آپ پر رحم فرمائے۔ اگر میں عمر کو نامزد نہ کروں تو آپ ہی کا انتخاب کروں۔''

ان کے بعد آپ نے کبار صحابہ میں سے حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ اور حضرت اُسید بن حُضیر رضی اللہ عنہ کی رائے لی۔ حضرت اُسید رضی اللہ عنہ نے کہا: ''آپ کے بعد وہی سب سے بہتر نظر آتے ہیں۔''

کافی مشاورت کر چکے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بلایا اور حسبِ ذیل تحریر لکھوائی:

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یہ تحریر ابوبکر بن ابی قحافہ نے اس وقت لکھوائی جبکہ وہ دنیا سے رخصت ہو کر آخرت کے سفر پر روانہ ہونے والا ہے۔ ایسے وقت جب کافر ایمان لے آتا ہے، فاجر کو یقین آجاتا اور جھوٹا سچ بولنے لگتا ہے۔ میرے بعد جو آدمی خلیفہ ہوگا، اس کا نام ہے ......'' املا کراتے کراتے یہاں پہنچے تو آپ کو غش آگیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا نام لکھ دیا۔ ہوش میں آئے تو فرمایا: ''ذرا پڑھ کر سنائیے، کیا لکھا ہے آپ نے۔''

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تمام تحریر پڑھ کر سنائی۔ آخر میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا نام بھی پڑھا۔ خلیفۂ رسول نے اُن کا نام سن کر بے اختیار اللہ اکبر کہا اور فرمایا: ''شاید آپ کو یہ خدشہ ہوا تھا کہ غشی ہی کے عالم میں میری روح پرواز کر جائے گی اور خلیفہ کے متعلق لوگوں میں اختلاف پڑ جائے گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا کرے۔ آپ نے بالکل درست لکھا۔''

یہ کہہ کر تحریر خلافت کا اختتامیہ لکھوایا:

''سونئے خلیفہ کی بات سننا اور اس کا کہا ماننا۔ میں نے اللہ سے، اس کے رسول سے، اس کے دین سے، تم سے اور اپنے آپ سے بھلائی کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ نیا خلیفہ اگر عدل و انصاف سے کام لیتا ہے تو اس کے متعلق میرا یہی حسنِ ظن ہے۔ میں اسے ایسا ہی سمجھتا ہوں۔ اگر وہ بدل جاتا ہے تو ہر آدمی وہی کچھ پائے گا جو اس نے کمایا۔ میں نے تو بھلائی ہی کا ارادہ کیا ہے۔ غیب کا علم مجھے نہیں۔

﴿ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ۝﴾

''اور جنھوں نے ظلم کیا وہ عنقریب جان لیں گے کہ وہ لوٹنے کی کیسی (خوفناک) جگہ لوٹتے ہیں۔'' [1]

تحریر مکمل ہوئی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خلیفۂ رسول کے حکم سے تحریر کو مہر بند کیا اور اسے ہاتھ میں لیے باہر تشریف لائے۔ باہر آتے ہی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، حضرت اُسید بن حُضیر رضی اللہ عنہ اور حضرت اُسید بن سعید قرظی رضی اللہ عنہ بھی اُن کے ہمراہ ہو لیے۔ تمام

[1] الشعراء 26:227.

لوگ بڑی بے چینی سے ان کے منتظر تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ان کے درمیان پہنچے تو کہا: ''اس مہر بند تحریر میں جن صاحب کا نام لکھا ہے، کیا آپ سب ان کی بیعت کریں گے؟''

لوگوں نے بیک زبان کہا: ''جی ہاں۔''

اِس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: ''وہ صاحب عمر بن خطاب ہیں۔''

سب لوگوں نے سرِ تسلیم خم کیا اور ہنسی خوشی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی بیعت نئے خلیفہ کے طور پر کی۔

خلیفۂ ثانی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ

بیعت مسجدِ نبوی میں انجام پائی تھی۔ تمام مسلمانوں سے بیعت لینے کے بعد حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ منبر نبوی پر جلوہ افروز ہوئے۔ حمد و ثنا اور درود و سلام کے بعد فرمایا: ''ایمان والو! میں تین دعائیں کرتا ہوں، آپ آمین کہنا۔

''اے اللہ! میں کمزور ہوں۔ مجھے طاقتور کر دے۔ بارِ الٰہا! میں سخت ہوں۔ مجھے نرم کر دے۔ خدایا! میں بخیل ہوں۔ مجھے سخی کر دے۔''[112]

پھر فرمایا: ''اگر مجھے پتہ ہوتا کہ کوئی اور بارِ خلافت اٹھانے کے لیے مجھ سے زیادہ قوی ہے تو والی بننے کے مقابلے میں گردن کٹوانی مجھے زیادہ بھلی معلوم ہوتی۔''

مزید فرمایا: ''میرے صاحب کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ کو مجھ سے اور مجھ کو آپ سے آزما لیا ہے۔ اِس لیے بخدا! ایسا ہرگز نہیں ہوگا کہ آپ کا کوئی معاملہ میرے سامنے آئے اور میرے علاوہ اسے کوئی اور ہاتھ میں لے۔ اور ایسا بھی نہیں ہوگا کہ کوئی معاملہ میرے سامنے پیش نہ ہو تو میں اس کے متعلق سچے اور

[112] طبقات لابن سعد: 197/3.

ایماندار افراد کی بات پر یقین نہ کروں۔ اگر لوگ اچھے طور اطوار اختیار کریں گے تو میں بھی ان سے اچھا برتاؤ کروں گا لیکن اگر وہ برائی پر اتر آئیں گے تو میں انھیں نشانِ عبرت بنا ڈالوں گا۔"[1]

بعد ازاں آپ کو پتہ چلا کہ لوگ آپ کی تقریر کے باعث سخت خائف ہیں۔ اور تو اور انھوں نے گھروں کے آنگن میں معمول کی مجلس آرائیاں بھی ترک کر ڈالی ہیں۔ آپ نے فوراً منادی کرادی کہ سب لوگ مسجد میں اکٹھے ہو جائیں۔ تمام لوگ مسجد میں آگئے تو آپ منبر پر تشریف فرما ہوئے۔ حمد و ثنا اور درود و سلام کے بعد فرمایا:

"مجھے پتہ چلا ہے کہ لوگ میری شدت سے خائف ہیں۔ لوگو! مجھے آپ کے معاملات کا والی بنایا گیا ہے۔ آپ کو یہ جان لینا چاہیے کہ میری شدت نرم پڑ چکی ہے۔ ہاں! مسلمانوں پر ظلم و زیادتی کرنے والوں کے خلاف میری شدت حرکت میں آئے گی۔ جو لوگ امن و سلامتی کے خوگر، متدین و متشرع اور اعتدال پسند ہیں، ان کے لیے میں اس سے کہیں زیادہ نرم ہوں جتنا وہ ایک دوسرے کے لیے نرم ہیں۔ میں کسی کو کسی پر ظلم و زیادتی نہیں کرنے دوں گا بلکہ ظالم کو زمین پر گراؤں گا اور اس کے جبڑے پر پاؤں رکھ کر اس سے حق منواؤں گا۔ اس کے مقابلے میں جو لوگ شریف الطبع، نیک نہاد، سفید پوش اور روکھی سوکھی پر گزارہ کرنے والے ہیں، ان کے روبرو میں اپنا رخسار زمین پر رکھوں گا۔

"لوگو! میرے ذمے آپ کے چند حقوق ہیں جن کا میں ذکر کرتا ہوں۔ ان کی ادائیگی میں کوتاہی پر آپ میرا مواخذہ کر سکتے ہیں۔ میں آپ کا خراج اور آپ

---

[1] طبقات ابن سعد: 196/1

کے اموال غنیمت حسبِ ضرورت خرچ کروں گا۔ آپ کے وظائف اور آپ کی تنخواہوں میں ان شاء اللہ تعالیٰ اضافہ کروں گا۔ ملک کی سرحدوں کو محفوظ بناؤں گا اور انھیں مستحکم کروں گا۔ جب آپ فوجی مہمات پر جایا کریں گے تو آپ کی واپسی تک باپ بن کر آپ کے اہل وعیال کی نگہداشت کیا کروں گا۔''[1]

یوں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انھی چند باتوں میں اپنا دستور خلافت بیان کر دیا۔ اس دستور کی تشکیل کے سلسلے میں انھوں نے براہِ راست کتاب اللہ سے، نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلیفۂ اول کے فیضِ صحبت سے استفادہ کیا تھا۔ اکیسویں صدی کی ترقی یافتہ اور مہذب اقوام جو انسانی حقوق کے تحفظ کا دعویٰ رکھتی ہیں، آج بھی جبکہ دنیا اِس قدر ترقی کر چکی ہے اور کاروانِ علم وعقل منزلوں آگے نکل چکا ہے، انسانی حقوق کی پاسداری اور احترام آدمیت کا وہ لائحہ عمل پیش نہیں کر سکیں جسے خلیفۂ ثانی نے آج سے چودہ سو برس پیشتر نہ صرف تشکیل دیا تھا بلکہ اس پر عمل بھی کر دکھایا تھا۔ انھوں نے مسلمانوں کے روبرو جو حلف اٹھایا تھا، اسے پورا کرنا اور خود پر جو ذمے داریاں عائد کی تھیں، ان سے عہدہ برآ ہونا بڑے آدمیوں کا کام ہے۔ وہی افراد جنھیں اللہ تعالیٰ بدنی قوت کے ساتھ ساتھ علم وحکمت کی روحانی طاقت بھی عطا کرتا اور ان کے دلوں کو ایمان کی روشنی سے منور کرتا ہے۔

اراکین کابینہ کا انتخاب

اراکین کابینہ کے انتخاب کے سلسلے میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ہمیشہ صحابۂ کرام سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ مشاورت ان کا ایک ایسا اصول تھا جس سے وہ جنگ ہو یا

[1] كتاب الخراج لأبي يوسف، ص: 140.

امن، کبھی انحراف نہیں کرتے تھے۔ ذیل میں ایک واقعہ درج کیا جاتا ہے۔ اس سے پتہ چلے گا کہ وہ اپنی کابینہ کے اراکین میں کیا کیا خوبیاں دیکھنا چاہتے تھے۔ ایک مرتبہ انھیں نئے عہدیدار کی ضرورت پڑی۔ صحابۂ کرام سے فرمایا کہ کوئی اہل آدمی بتاؤ، ایک معاملہ سر پہ آن پڑا ہے۔ صحابۂ کرام نے ایک صاحب کا نام لیا۔ فرمایا: نہیں، وہ ہمارے کام کا نہیں۔ عرض کیا: آپ کو کیسا آدمی درکار ہے؟ فرمایا: مجھے ایسا آدمی چاہیے کہ جب وہ لوگوں کے درمیان ہو اور ان کا امیر نہ ہو تو یوں معلوم ہو کہ وہ ان کا امیر ہے۔ اور جب وہ لوگوں کا امیر ہو تو یوں معلوم ہو کہ وہ انھی میں سے ایک عام آدمی ہے۔ عرض کیا: یہ خوبی تو صرف ربیع بن زیاد حارثی میں پائی جاتی ہے۔ فرمایا: بالکل ٹھیک کہتے ہو، چنانچہ آپ نے اس انتظامی عہدے کے لیے حضرت ربیع بن زیاد حارثی کا تقرر کیا۔ خلیفۂ ثانی کسی منصب پر نئے عہدیدار کا تقرر کرتے تو اس سے عہد نامے پر دستخط کراتے اور چند صحابۂ کرام کو اُس کا گواہ بناتے تھے۔ نئے عہدیدار سے عام طور پر یہ عہد لیتے تھے کہ وہ ظلم نہیں کرے گا، نہ اپنے منصب کا ناجائز فائدہ اٹھائے گا۔ یوں وہ عہدیدار اُس طرح حلف اٹھاتا تھا جس طرح آج کل کے ڈاکٹر، جج، وزیر اور حساس عہدوں پر فائز ہونے والے افسر حلف اٹھاتے ہیں۔ حلف لینے کے بعد وہ عہدیدار کے دائرۂ اختیار کی حدود متعین کرتے:

> ”میں نے تمھیں مسلمانوں کے جسم و جاں اور ان کی عزتوں کا حاکم نہیں بنایا۔ میں نے تمھارا تقرر اس لیے کیا ہے کہ تم لوگوں میں نماز قائم کرو، ان میں عطیات و وظائف اور زکات و صدقات تقسیم کرو اور عدل و انصاف سے کام لیتے ہوئے ان کے جھگڑے نمٹاؤ۔“

پھر آپ اُس پر چار پابندیاں عائد کرتے۔ ''ترکی گھوڑے پر سواری نہیں کرو گے۔ باریک لباس نہیں پہنو گے۔ میدہ نہیں کھاؤ گے۔ ضرورت مندوں کے لیے دروازہ کھلا رکھو گے۔''[11]

عہدیداروں کو ان کے عہدوں پر روانہ کرتے وقت فرمایا کرتے:

''میں آپ کو بے رحم اور سنگدل حکام بنا کر نہیں بھیج رہا۔ میں آپ کو مقتدا و پیشوا بنا کر بھیج رہا ہوں، اس لیے مسلمانوں کو زد و کوب کر کے انھیں ذلیل و رسوا نہ کیجیے گا۔ نہ ان کی جا و بے جا تعریف کر کے انھیں آزمائش میں ڈالیے گا۔ اور نہ ضرورت مندوں کو منع کر کے ان پر ظلم کیجیے گا۔''

ایک مرتبہ تمام حاکموں کو لکھا کہ حج کے موقع پر ذرا تشریف لائیے۔ رعایا کی بڑی تعداد بھی حج کے موقع پر مدینہ حاضر ہوئی تھی۔ آپ نے ان سے خطاب کیا اور فرمایا:

''اے لوگو! میں نے بخدا اپنے حاکموں کو آپ کے ہاں اِس لیے نہیں بھیجا کہ وہ آپ کی چمڑیاں ادھیڑیں، نہ اس لیے کہ وہ آپ کا روپیہ ہتھیا لیں۔ میں نے تو انھیں آپ کے ہاں اس لیے بھیجا ہے کہ وہ آپ کو دین کی باتیں سکھائیں اور سنت نبوی سے روشناس کرائیں۔ سو جس سے اس برتاؤ کے علاوہ کوئی اور برتاؤ کیا گیا ہے، وہ مجھے بتائے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میں اسے قصاص دلا کر رہوں گا۔''

اس پر حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ عرض کیا: ''یا امیر المومنین! اس کے متعلق بھی رہنمائی فرمایئے کہ والی، رعایا کے بعض افراد کو ادب دینے کے لیے مارے، کیا آپ اِس کا بھی قصاص لیں گے؟''

[11] كتاب الخراج لأبي يوسف، ص: 139، وعيون الأخبار: 53/1.

فرمایا: ''ہاں۔ قسم اُس کی ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں اس کا بھی قصاص لوں گا کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا آپ بنفس نفیس قصاص دینے کو تیار ہو جاتے تھے۔ میری یہ بات کان کھول کر سن لیجیے، مسلمانوں کو زد وکوب کر کے انھیں ذلیل و رسوا نہ کیجیے گا۔ ان کے حقوق کی ادائیگی نہ کر کے انھیں کافر بننے پر مجبور نہ کیجیے گا۔ انھیں نشیب میں اتار کر ضائع مت کیجیے گا۔''

اتنے میں ایک آدمی کھڑا ہوا۔ اُس نے عرض کیا:

''یا امیر المومنین! آپ کے عامل (عہدیدار، حاکم) نے مجھے سو کوڑے مارے تھے۔''

آپ نے فوراً اس عہدیدار سے جواب طلب کیا۔ سو کوڑے مارنے کا کوئی معقول جواز اس کے پاس نہیں تھا۔ آپ نے اس آدمی سے کہا کہ اٹھو اور اس سے قصاص لو۔ یہاں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے مداخلت کی۔ عرض کیا کہ امیر المومنین! ہم اس آدمی کو راضی کیے لیتے ہیں۔ فرمایا: بہت خوب، اسے راضی کر لیجیے تو ٹھیک ہے، چنانچہ انھوں نے مضروب کو دو سو اشرفی پر راضی کر لیا، یعنی ہر کوڑے کے بدلے میں دو اشرفی۔[1]

قبل اس سے کہ عمال حکومت کے لیے کوئی لائحہ عمل وضع کرتے اور اس پر عمل کراتے، خود ایک لائحہ عمل پر عمل پیرا تھے۔ اس لائحہ عمل کی چند اہم شقیں یہ تھیں:

''حکومت، حاکم اور رعایا دونوں کے لیے آزمائش کی حیثیت رکھتی ہے۔''

''حاکم کے مزاج میں سختی ہونی چاہیے تاہم یہ سختی جبر و قہر کی صورت اختیار نہ کرے۔''

''اور اس کے برتاؤ میں نرمی بھی ہونی چاہیے لیکن کمزوری معلوم نہ ہو۔''

---

[1] كتاب الخراج لأبي يوسف، ص: 139,138، وتاريخ الطبري: 2015.

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے طرزِ خلافت کا ایک اہم پہلو یہ بھی تھا کہ خلیفہ تمام عمال حکومت کے متعلق فرداً فرداً جوابدہ ہے۔ محض اچھے وزیر کا تقرر کر کے اس کی ذمے داری پوری نہیں ہو جاتی۔

زمانۂ خلافت میں ایک روز چند حضرات آپ کی خدمت میں حاضر تھے۔ مختلف سیاسی وسماجی امور زیر بحث آئے۔ آپ نے انھیں مخاطب کر کے فرمایا: ''اگر میں ایک آدمی کو اپنے علم کے مطابق آپ کے لیے بہتر خیال کروں، اسے آپ کا عامل مقرر کر دوں اور انصاف کرنے کا حکم دوں تو آپ کے خیال میں کیا میں نے اپنا حق ادا کر دیا؟''

انھوں نے جواب دیا کہ جی ہاں۔ آپ نے تو اپنا حق ادا کر دیا۔

فرمایا: نہیں، اس وقت تک میرا فرض ادا نہیں ہوتا جب تک میں یہ اطمینان نہ کرلوں کہ اس عہدیدار کو میں نے جو احکامات دیے تھے، اس نے ان کی تعمیل بھی کی ہے کہ نہیں۔ ایک مرتبہ لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''مجھ پر آپ کا یہ حق ہے کہ میں آپ کے خراج کی رقوم اور اموال غنیمت میں سے ناحق کچھ نہ لوں۔ مجھ پر آپ کا یہ بھی حق ہے کہ آپ کا جو روپیہ میرے ہاتھ آئے، میں اسے مستحق افراد پر ہی خرچ کروں۔ یہ امر بھی میں اپنے ذمے لیتا ہوں کہ ان شاء اللہ آپ کے وظائف میں اضافہ کروں گا اور ملک کی سرحدوں کو مزید مستحکم بناؤں گا۔ آپ مجھ پر یہ بھی حق رکھتے ہیں کہ میں آپ کو ایسی مہمات پر روانہ نہ کروں جن میں ہلاکت یقینی ہو۔ اور یہ بھی کہ آپ کو سرحدوں پر ہی تعینات نہ کیے رکھوں۔ اور یہ بھی کہ جب آپ فوجی مہمات پر روانہ ہوں تو آپ کی واپسی تک باپ بن کر آپ کے اہل وعیال کی نگہداشت کروں۔ سو

اے للہ کے بندو! اللہ کا تقویٰ اختیار کیجیے۔ اپنے سلسلے میں میری یوں مدد کریے کہ قصور وار بن کر بھی میرے رو برو مت آئیے۔ اور میرے سلسلے میں میری مدد یوں کریے کہ مجھے نیکی کا حکم دیجیے، برائی سے منع کیجیے اور اللہ تعالیٰ نے مجھے آپ کے جن معاملات کا متولی بنایا ہے، ان کے متعلق مجھے نصیحت کرتے رہا کیجیے۔''

یہ تھے خلیفۂ ثانی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جو اپنی رعایا سے ایسا برتاؤ کرتے تھے جیسا برتاؤ باپ اپنے بچوں سے کرتا ہے۔ باپ نہ صرف اپنے بچوں کے روز مرہ اخراجات برداشت کرتا اور ان کی پرورش کرتا ہے بلکہ وہ اپنی اولاد کے لیے اپنے جان و مال کی بھی پروا نہیں کرتا۔ فرزندانِ اسلام کے ساتھ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا طرزِ معاملت بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ ان کے بے مثال طرزِ حکومت کا ایک روشن پہلو یہ بھی تھا کہ وہ جس آدمی کو لوگوں کا امیر مقرر کرتے، اس کے اثاثوں کی جانچ پڑتال کرتے اور اس کی ہمہ وقت نگرانی کے لیے اپنے جاسوس بھی روانہ کرتے جو انھیں اس عہدیدار کے طور اطوار اور عمل و کردار کی برابر خبر کرتے رہتے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو بحرین کا عامل (وزیر) مقرر کیا تو وہ دس ہزار روپے ہمراہ لائے۔ خلیفۂ ثانی نے دیکھا تو تعجب کیا۔ فرمایا: ''اچھا تو یہ تمام روپیہ آپ کا ہے! ذرا بتائیے تو، یہ روپیہ کہاں سے آیا۔''

وہ بولے: ''ایک تو میرے گھوڑوں کی افزائش نسل ہوئی ہے۔ دوسرے آپ کی طرف سے جو تنخواہ پاتا تھا، وہ جمع ہوتی رہی۔ تیسرے میرا ایک غلام ہے جو میرے لیے روپیہ کماتا ہے۔''

خلیفہ ثانی نے تفتیش کرائی تو ان کی بات درست نکلی۔ بعدازاں آپ نے انھیں بلا

بھیجا اور منصبِ وزارت پر دوبارہ فائز کرنا چاہا تو انھوں نے انکار کر دیا۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''آپ حکمرانی کو ناپسند کرتے ہیں حالانکہ یوسف علیہ السلام جو آپ سے بہتر تھے، انھوں نے خود حکومت طلب کی تھی۔''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے جواباً عرض کیا: ''یوسف علیہ السلام نبی ابن نبی تھے اور میں ابو ہریرہ ابنِ امیمہ ہوں۔''[1]

ایک دفعہ ایک عمارت کے قریب سے گزرے جو پتھر اور چونے کے مسالے سے بنائی جارہی تھی۔ دریافت فرمایا کہ یہ کس کا مکان ہے۔ لوگوں نے بتایا کہ بحرین پر آپ ہی کا مقرر کردہ عامل ہے، اس کا مکان ہے یہ۔ فرمایا: ''آخر درہم پر پُرزے نکالنے لگے۔''

منبر پر جلوہ افروز ہوئے اور فرمایا: ''اے امراو حُکام! یہ مال و متاع، اگر ہم سمجھتے کہ ہمارے لیے حلال ہے تو ہم اسے آپ کے لیے بھی حلال قرار دے دیتے۔ لیکن جب ہم نے اسے اپنے لیے حلال نہیں کیا اور اس سے دامن بچائے ہوئے ہیں تو آپ بھی اس سے دامن بچائیے۔ واللہ! آپ کی مثال تو اس پیاسے کی سی ہے جو بے قراری کے عالم میں دریا کے بیچوں بیچ کود پڑتا اور سیراب ہو کر ڈوب مرتا ہے۔''[2]

افواج کی سپہ سالاری زیادہ تر ان صحابۂ کرام کو سونپتے تھے جو ابتدائی دور میں اسلام لائے تھے تاہم جن کی کارکردگی اس باب میں بہت نمایاں ہوتی انھیں ہر حال میں ترجیح دیتے تھے۔ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ جس آدمی کو افواج کا سپہ سالار بنایا جائے وہ نہایت سنجیدہ، بردبار، متحمل مزاج اور دور اندیش ہو۔ وہ جو بھی اقدام اٹھائے، نہایت

[1] الإصابة: 4/310، وعيون الأخبار: 1/53. [2] شرح نهج البلاغة: 3/104.

سوچ سمجھ کر اٹھائے۔ وہ مواقع غنیمت کی پہچان رکھتا ہو اور ان سے بروقت فائدہ اٹھانے کی بھرپور صلاحیت سے بہرہ یاب ہو۔ اسے اس امر کا بخوبی ادراک ہو کہ کب اور کہاں لڑنا ہے، نیز کب اور کہاں لڑائی سے ہاتھ کھینچ لینا ہے۔ ایک مرتبہ سلیط نامی ایک بہادر سے فرمایا: ''اگر تم میں جلد بازی کا شائبہ نہ ہوتا تو میں تمھیں سپہ سالار بنا دیتا لیکن جنگ کے لیے بردبار و متحمل مزاج آدمی ہی موزوں رہتا ہے۔''[1]

وہ ہمیشہ ایسے سپہ سالار کو ترجیح دیتے تھے جو مضبوط و توانا ہونے کے ساتھ ساتھ اثر ورسوخ کا بھی مالک ہوتا تھا۔ جو اپنی بات منوانے کی اور لوگوں سے حسبِ لیاقت کام لینے کی قابلیت رکھتا تھا۔ جب انھیں موجودہ سپہ سالار سے زیادہ موثر سپہ سالار میسر آ جاتا تو فوری طور پر اس کا تقرر کر دیتے تھے۔ حضرت شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ کو شام کی ولایت سے برطرف کر کے حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کو شام کا والی بنایا تو لوگوں کے روبرو ابن حسنہ رضی اللہ عنہ کی صفائی پیش کی اور برطرفی کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا: ''میں نے ابنِ حسنہ کو ناراضگی سے معزول نہیں کیا۔ دراصل مجھے قوی آدمی کی تلاش تھی۔''[2]

اکثر فرمایا کرتے تھے: ''مجھے اِس میں بہت حرج معلوم ہوتا ہے کہ مضبوط تر آدمی کے ہوتے ہوئے کسی اور کو سپہ سالار (یا امیر) بنادوں۔''

وہ سپہ سالار کو غیر معمولی نشانہ انداز اور بہت بہادر دیکھنا چاہتے تھے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو محاذ عراق کا سپہ سالار اعلیٰ بنایا تو فرمایا:

''وہ بڑا نشانہ انداز اور بہادر ہے۔''[3]

یہ تھی ان تمام اوصاف کی تفصیل جو خلیفۂ ثانی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے نزدیک

---

[1] البلاذري، ص:251. [2] الكامل لابن الأثير:217/2 [3] الفاروق القائد لمحمود شيت خطاب، ص:99.

سپہ سالار و قائد اور امیر میں پائے جانے ضروری تھے۔ والی یا عہدیدار کا انتخاب عمل میں آجاتا تو چھان بین اور تحقیقات کا نیا دور شروع ہوتا۔ اس کی ایک ایک حرکت پر کڑی نظر رکھی جاتی۔ اگر اس کا کوئی طرزِ عمل خلیفۂ ثانی کو ناگوار معلوم ہوتا تو اس سے جواب طلب کیا جاتا۔ قصور وار ثابت ہونے پر سزا دی جاتی اور بعض دفعہ عہدے سے معزول کر دیا جاتا۔

یہ عادل حکمران رعایا کی فکر میں رات رات بھر جاگتا تھا۔ اس نے رعایا میں کامل مساوات قائم کی تھی۔ وہ ہر مستحق کو اس کا حق دیتا تھا۔ وہ مظلوم کو انصاف دلاتا اور ظالم کا ہاتھ روکتا تھا، خواہ وہ شہر کا والی ہوتا یا کوئی سرکاری عہدیدار۔ حکومتیں عدل و انصاف کی اِسی مضبوط بنیاد پر قائم رہتی ہیں۔

عادلانہ طرزِ حکومت کا نتیجہ تھا کہ رعایا کا عام سے عام فرد جو اپنے حقوق و فرائض سے آگاہ ہوتا، اس سے زیادتی کی جاتی یا اس کا حق مارا جاتا تو وہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھتا تھا جب تک وہ زیادتی کرنے والے سے بدلہ نہ لے لیتا یا اپنا حق حاصل نہ کر لیتا۔ حاکمِ وقت بھی اسے اس کا حق دینے کے سلسلے میں پس و پیش سے کام نہیں لیتا تھا۔ رعایا کو والی شہر سے جو بھی شکایت ہوتی وہ بلا تامل خلیفۂ ثانی کی خدمت میں عرض کی جاتی۔ خلیفہ فوری طور پر شکایت کا ازالہ کرتے اور والی شہر کو عوام کی عدالت میں صفائی پیش کرنی پڑتی۔

شہرِ حمص کے ایک باشندے خالد بن معدان بیان کرتے ہیں کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے سعید بن عامر جمحی رضی اللہ عنہ کو حمص کا والی بنایا۔ دورۂ حمص کے دوران میں اُنھوں نے اہلِ حمص سے ان کے حکمران کے متعلق دریافت کیا۔ انھوں نے خلیفہ کے روبرو سعید بن عامر جمحی کی

چار شکایات پیش کیں۔ عُمالِ حکومت کی شکایات کے سلسلے میں حمص کو 'چھوٹا کوفہ' کہا جاتا تھا۔ اہل حمص بھی اہلِ کوفہ کی طرح حکمرانوں سے خواہ مخواہ نالاں رہتے تھے۔

پہلی شکایت انھوں نے یہ بیان کی کہ سعید بن عامر خوب دن چڑھے گھر سے نکلتے ہیں۔ عمر نے کہا یہ تو بڑی کوتاہی ہے۔ اور کیا شکایت ہے؟ اہل حمص نے کہا کہ وہ رات کو کسی سے نہیں ملتے۔ فرمایا یہ بات بھی غیر معمولی ہے۔ اور کیا شکایت ہے؟ انھوں نے کہا وہ مہینے بھر میں ایک دن گھر سے نکلتے ہی نہیں۔ فرمایا یہ بات بھی نظر انداز کرنے کے لائق نہیں۔ اگلی شکایت کیا ہے؟ اہل حمص نے کہا کبھی کبھار انھیں غش آجاتا ہے اور وہ ہوش وحواس سے بیگانہ ہو جاتے ہیں۔

عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو ایک جگہ اکٹھے ہونے کو کہا اور حمص کے والی سعید بن عامر جمحی رضی اللہ عنہ کو بلا بھیجا۔ آپ نے یہ دعا فرمائی: ''یا اللہ! میرے انتخاب کو غلط ثابت مت کرنا۔'' تمام لوگ اکٹھے ہوئے تو مقدمے کی سماعت شروع ہوئی۔ آپ نے سعید بن عامر جمحی کے روبرو لوگوں سے دریافت کیا: ''کیا شکایت ہے تمھیں اِن سے؟'' لوگوں نے کہا: ''یہ دن چڑھے گھر سے نکلتے ہیں۔'' آپ ابن عامر کی طرف متوجہ اور فرمایا: ''آپ کیا کہتے ہیں؟''

انھوں نے کہا: ''بخدا! میں اس کی وجہ زبان پر لانی نہیں چاہتا تھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ میرے ہاں کوئی خادم نہیں، اس لیے میں صبح سویرے آٹا گوندھتا ہوں اور انتظار میں بیٹھ جاتا ہوں۔ خمیر اٹھتا ہے تو روٹی پکاتا ہوں۔ ناشتہ کر کے وضو کرتا اور گھر سے نکل کر لوگوں کی خدمت میں حاضر ہو جاتا ہوں۔''

عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے کہا: ''اگلی شکایت پیش کرو۔''

لوگوں نے کہا: ''یہ رات کو کسی سے نہیں ملتے۔''

عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ابن عامر سے فرمایا: ''اِس کی وجہ بیان کریں۔''

انھوں نے جواب دیا کہ اس کی وجہ بھی میں بیان کرنی نہیں چاہتا تھا لیکن اب بتاتا ہوں کہ میں نے دن کے اوقات لوگوں کی خدمت کے لیے وقف کر رکھے ہیں اور رات کے اوقات اللہ کی عبادت کے لیے۔''

''تیسری شکایت کیا ہے؟'' عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ لوگوں نے کہا: ''مہینے بھر میں ایک دن یہ گھر سے باہر ہی نہیں آتے۔''

''اس کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں؟'' عمر بن خطاب نے ابن عامر سے دریافت کیا۔

وہ بولے: ''میرے ہاں کوئی خادم نہیں جو میرے کپڑے دھو دیا کرے۔ یہ کپڑے جو پہن رکھے ہیں، اِن کے علاوہ اور کوئی کپڑے بھی نہیں۔ انھیں دھو کر ان کے خشک ہونے کا انتظار کرتا ہوں۔ کپڑے پہن کر دن ڈھلے لوگوں کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں۔''

''اور کوئی شکایت؟'' خلیفۂ ثانی نے لوگوں سے دریافت فرمایا۔

''انھیں کبھی کبھار بیٹھے بٹھائے غش آجاتا ہے۔'' لوگوں نے آخری شکایت پیش کی۔

آپ نے ابن عامر کو مخاطب کیا: ''اس کا سبب کیا ہے؟''

انھوں نے کہا: ''مکہ میں جب خبیب انصاری رضی اللہ عنہ کو شہید کیا گیا تھا تو اس وقت میں بھی وہاں موجود تھا۔ قریش کے سرداروں نے ان کا بدن ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور انھیں ایک تنے پر سولی دی، پھر ان سے کہا: کیا تم پسند کرو گے کہ تمھاری جگہ محمد ہوتا۔ خبیب انصاری نے جواب دیا مجھے تو یہ بھی پسند نہیں کہ میں اپنے گھر والوں کے درمیان اطمینان سے بیٹھا ہوں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کانٹا بھی چبھ جائے۔ میں اس

وقت مشرک تھا۔ اس حالت زار میں ان کی مدد نہیں کر پایا تھا۔ جب بھی یہ بات یاد آتی ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ میرا وہ گناہ معاف نہیں کرے گا۔ تب مجھے غش آجاتا ہے۔‘‘

عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا: ’’خدا کا شکر ہے جس نے میری فراست کو غلط قرار نہیں دیا۔‘‘

آپ نے ہزار اشرفیاں ابنِ عامر کے ہاں روانہ کیں اور فرمایا کہ انھیں اپنے کام میں لائیے۔ [1]

نہایت عجیب حکمران تھے وہ! ان سے بھی عجیب تھی ان کی رعایا! جو چاہتی تھی کہ حاکمِ شہر کا اور رعایا کا ایسا گہرا تعلق ہو کہ رعایا دنیا کو حاکمِ شہر کی نظروں سے دیکھے اور حاکمِ شہر دنیا کو ان کی نظروں سے دیکھے۔ ان کے مابین ایسی ہم آہنگی ہو کہ حاکمِ شہر رعایا کے دماغ سے سوچے اور رعایا حاکمِ شہر کے دماغ سے کام لے کر لوگوں کی فلاح و بہبود کے منصوبے بنائے۔ حاکمِ شہر ہر چھوٹے بڑے معاملے میں ان کے نگہبان کے طور پر موجود ہو۔

والی شہر کی کوئی بات رعایا کو ناگوار معلوم ہوتی یا اس کے بعض معاملات رعایا کی نگاہوں سے پوشیدہ ہوتے تو وہ بلاتردد حاکمِ اعلیٰ سے رجوع کرتی تاکہ وہ والی شہر سے اس سلسلے میں ضروری پوچھ گچھ کرے اور ان کی شکایات کا ازالہ ہو۔

اور خلیفہ بھی کیا خلیفہ تھے! رعایا کی شکایات بے اُو بے بڑی توجہ سے سماعت کرتے۔ اور پوری کوشش کرتے کہ جیسے بھی ہو، رعایا کی شکایات کا ازالہ کیا جائے۔

ایسا بھی نہیں ہوتا تھا کہ رعایا کی شکایات تو کہیں اور سنی جائیں اور والی شہر سے کہیں

[1] حلیة الأولیاء:245/1، وتاریخ ابن عساکر:147/6۔

اور پوچھ گچھ ہو۔ خلیفہ ایک طرف رعایا کی شکایات سن کر ان سے ٹال مٹول کرے اور دوسری طرف اپنے مقرر کردہ والی شہر سے ساز باز کرے۔ ایسا نہیں ہوتا تھا بلکہ حاکمِ شہر کو عوام کی عدالت میں پیش ہو کر کڑے احتساب کے مرحلے سے گزرنا پڑتا تھا۔ یوں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جاتا اور حاکمِ شہر کے لیے ممکن نہیں رہتا تھا کہ وہ حکومت کے خلاف آواز اٹھانے والوں کو ڈرائے، دھمکائے، ان پر جھوٹے الزامات عائد کرے یا انھیں جیلوں میں ڈال دے۔ (تاہم حکامِ شہر بھی ظالم نہیں ہوتے تھے اور نہایت وسیع الظرفی سے عوام کی شکایات کا ازالہ کرتے تھے۔)

یوں حمص کے والی حضرت سعید بن عامر رضی اللہ عنہ خلیفۂ ثانی کی عدالت میں شکایات سے بری قرار پائے۔ عوام کو بھی اپنے والی کے متعلق اطمینان حاصل ہوا اور وہ ان کے حسنِ تدبیر اور ذمہ دارانہ طرزِ عمل سے متأثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ رعایا کی نگاہوں میں والی کا اعتبار بڑھا۔ رعایا اپنے والی سے محبت کرنے لگی اور اس کی قیادت میں ترقی کی منزلیں طے کرنے لگی۔

اسی قبیل کا ایک واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا ایک وفد خلیفۂ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے ان کے امیر کے متعلق پوچھا۔ انھوں نے کہا کہ امیر صاحب بالکل خیریت سے ہیں۔ ٹیلے پر اونچا گھر بنائے اسی میں رہتے ہیں۔ آپ نے فوراً ایک خط لکھا اور قاصد کے ہاتھ روانہ کیا۔ قاصد سے فرمایا: ”اونچے گھر کے دروازے پر جب پہنچنا تو لکڑیاں اکٹھی کر کے دروازے کو جلا ڈالنا۔“

قاصد وہاں پہنچا تو حضرت خلیفہ کے حسبِ ارشاد لکڑیاں اکٹھی کر کے دروازے کو آگ لگا دی۔ لوگ بھاگم بھاگ والی شہر کی خدمت میں گئے اور بتایا کہ ایک آدمی آپ

کے گھر کے دروازے کو آگ لگا رہا ہے۔ والی شہر نے کہا وہ جو کرتا ہے، اسے کرنے دو۔ وہ امیر المومنین کا ایلچی ہے۔

دروازے کو آگ لگانے کے بعد وہ والی شہر کی خدمت میں گیا اور انھیں امیر المومنین کا خط دیا۔ اس میں لکھا تھا کہ خط پاتے ہی فوراً چلے آئیے۔ وہ فوراً سوار ہو کر چل پڑے۔ امیر المومنین کی خدمت میں پہنچے تو انھوں نے ملاقات کے لیے نہیں بلایا۔ تین دن گزرے تو بلا بھیجا۔ وہ حاضرِ خدمت ہوئے تو فرمایا: ''ابن قرط! ذرا حرہ کے میدان میں مجھ سے ملیے۔''

حرہ کے میدان میں زکات کے اونٹ بکریاں چرتے تھے۔ ابن قرط حرہ میں پہنچے تو آپ نے ایک ڈول ان کے ہاتھ میں دیا اور فرمایا: ''اونٹوں کو پانی پلائیے۔'' وہ پانی پلاتے پلاتے تھک گئے تو آپ نے فرمایا: ''ابن قرط! لگتا ہے کہ عرصہ ہوا، اس کام سے آپ کا پالا نہیں پڑا۔'' ابن قرط کھسیانی ہنسی ہنسے اور کہا: ''جی ہاں، عرصہ ہوا۔''

فرمایا: ''اسی لیے آپ نے اونچا گھر بنا کر مسلمانوں سے، بیواؤں اور یتیموں سے بلند ہونے کی کوشش کی ہے، جائیے، اپنا منصب سنبھالیے اور آئندہ ایسا مت کریے گا''

ابن قرط بہت اچھے حاکم تھے۔ عوام سے بہت اچھا سلوک کرتے تھے۔ ان کے حقوق کا پورا پورا خیال رکھتے تھے۔ اونچے ٹیلے پر ان کا گھر بنانا حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو پسند نہیں آیا۔ والی کا یہ طرز عمل ان کی افتادِ طبع کے خلاف تھا۔ ان کا خیال تھا کہ حکمران بھی رعایا ہی کا عام فرد ہوتا ہے۔ رعایا کے مقابلے میں اسے کوئی برتری حاصل نہیں ہونی چاہیے۔ ہاں اگر وہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ نیک اور زیادہ تقویٰ شعار ہے تو اسے برتر تسلیم کرنا چاہیے۔ اس کے حکمران ہونے کا یہ مطلب

ہرگز نہیں کہ اس کے اور دوسروں کے حقوق و فرائض میں کوئی فرق ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی ہرگز نہیں کہ وہ دوسروں کے مقابلے میں اونچا گھر بنا کر اونچائی سے لوگوں کو جھانکے۔ یوں لوگ اسے کیڑے مکوڑے نظر آئیں اور وہ انھیں حقیر جانے۔ وہ اپنے گھر کے اونچے اونچے مضبوط دروازے بنالے اور ان پر دربان کھڑے کر دے تا کہ کوئی عام آدمی اس تک نہ پہنچ پائے۔ یہ تمام باتیں خلیفۂ ثانی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو منظور نہیں تھیں۔ وہ حکمرانوں کو عوام کے قریب دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ حکمران بذاتِ خود عوام کے معاملات میں دلچسپی لیں۔ وہ بذاتِ خود عوام کے حالات سے واقفیت حاصل کریں۔ یوں وہ عوام کی فلاح و بہبود کے کام بہتر طریقے سے انجام دے پائیں گے۔ لیکن اگر وہ اپنے محل کے دروازے بند کر کے اُن پر دربان لا بٹھائیں گے تو عوام کی شکایات انھیں نہیں پہنچیں گی۔ یوں عوام غم و غصے کا شکار ہو کر بغاوت پر اتر آئیں گے۔ حکمرانوں کے کارندے عوام کی جاسوسی کر کے باغیوں کا پتہ چلائیں گے۔ مار پیٹ کریں گے۔ پکڑ دھکڑ ہوگی۔ اس طرح ریاست کا سیاسی استحکام بگڑ جائے گا اور ریاست کا سیاسی استحکام ایک دفعہ بگڑ جائے تو اس کا سنورنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ تمام باتیں فتنوں کو ہوا دیتی ہیں۔ حکمران ایسی باتوں سے احتراز کریں اور ملک میں مساوات قائم کیا کریں تو ملک میں سیاسی استحکام پیدا ہوتا اور ملکی معیشت بھی مضبوط ہوتی ہے۔ یوں فتنوں کو بھی ہوا نہیں ملتی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت ایسی بے اعتدالیوں سے پاک تھا۔ اُن کا مقرر کردہ والی یا عہدیدار جادۂ حق سے ذرا بھی انحراف کرنا چاہتا تو ان کا درہ اس کی درگت بنانے کو فوراً آموجود ہوتا اور بگڑتے عہدیدار کی تمام کلیں سیدھی ہو جاتیں۔

خلیفۂ ثانی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا معمول مبارک تھا کہ وہ اپنے وزیروں سے میل ملاقات رکھتے اور ان کے حال احوال سے واقف رہتے تھے۔ انھوں نے عمیر بن سعد کو حمص کا والی بنایا تو ایک برس گزر گیا، ان کی کوئی خیر خبر نہ آئی۔ نہ وہ آپ سے ملاقات کرنے آئے۔ آپ نے اپنے منیم سے کہا عمیر بن سعد کو لکھیے کہ جونہی ہمارا خط ملے، فوراً چلے آئیں۔ خراج وغیرہ کی رقم بھی ساتھ لیتے آئیں۔ معلوم ہوتا ہے انھوں نے ہم سے خیانت کی ہے۔

عمیر بن سعد کو جونہی خط ملا، انھوں نے رخت سفر باندھا اور حمص سے نکل کھڑے ہوئے۔ مدینہ منورہ پہنچے تو رنگ اڑا ہوا، چہرہ غبار آلود، بال لمبے اور پراگندہ۔ خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سلامِ خلافت عرض کیا۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے پوچھا کیسے ہو؟ کہنے لگے جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں، صحیح سلامت، ٹھیک ٹھاک، دنیا میرے ساتھ ہے۔ اسے اس کے سینگ سے پکڑ کر کھینچے لا رہا ہوں۔ دریافت فرمایا: کیا لائے ہو اپنے ہمراہ۔ وہ بولے ایک تھیلا جس میں زادِ راہ رکھتا ہوں۔ ایک پیالہ جس میں کھانا کھاتا ہوں۔ اسی میں پانی ڈال کر سر اور کپڑے دھوتا ہوں۔ ایک لوٹا ہے جس میں وضو کا اور پینے کا پانی رکھتا ہوں۔ اور ایک لاٹھی جس کے سہارے کھڑا ہوتا ہوں۔ اگر کوئی دشمن سامنے آئے تو اُسے لاٹھی سے دفع کرتا ہوں۔ بس، یہی ہے میری دنیا۔

''تو کیا پیدل آئے ہو؟'' خلیفۂ ثانی نے دریافت کیا۔

''جی ہاں۔''

''کوئی ایسا آدمی نہیں تھا جو تمھیں سواری دے دیتا؟''

''کسی نے سواری دی نہیں اور میں نے کسی سے مانگی نہیں۔'' عمیر بن سعد نے جواباً

عرض کیا۔

فرمایا: ''بہت برے مسلمان ہیں جن کے ہاں سے تم آئے ہو۔''

پھر دریافت کیا: ''میں نے تمھیں کہاں بھیجا تھا اور تم وہاں کیا کرتے رہے ہو؟''

''یا امیر المومنین! میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔'' عمیر بن سعد نے مؤدبانہ عرض کیا۔

''سبحان اللہ۔'' امیر المومنین نے تعجب کیا۔

اس پر انھوں نے کہا: ''اگر یہ خدشہ نہ ہوتا کہ میری باتوں سے آپ پریشان ہوں گے تو میں آپ کو کچھ نہ بتاتا۔ آپ نے مجھے حمص کا والی بنا کر بھیجا تو میں وہاں گیا۔ میں نے وہاں کے نیک افراد کو بلایا اور انھیں خراج اکٹھا کرنے پر مامور کیا۔ وہ خراج کی رقم اکٹھی کرلائے تو میں نے وہ تمام رقم وہاں کے مستحق افراد میں تقسیم کر ڈالی۔ آپ کے لیے کچھ بچتا تو ضرور حاضرِ خدمت کرتا۔''

''تو تم ہمارے لیے کچھ نہیں لائے؟'' امیر المومنین نے دریافت کیا۔

''جی نہیں۔'' عمیر بن سعد نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

امیر المومنین نے منیم سے فرمایا کہ عمیر بن سعد کو نیا پروانۂ وزارت لکھ دیجیے۔ یہ اپنے عہدے پر برقرار رہیں گے۔

عمیر بن سعد نے عرض کیا: ''اب مجھے معاف رکھیے۔ جو ہوا سو ہوا۔ آئندہ میں آپ سے اور آپ کے بعد بھی کسی خلیفہ کی طرف سے کوئی عہدہ قبول نہیں کروں گا۔''

امیر المومنین کی اجازت سے وہ اپنے گھر چلے گئے۔ ان کا گھر مدینہ منورہ سے کئی میل دور واقع تھا۔ ان کے جانے کے بعد امیر المومنین نے مصاحبوں سے کہا کہ لگتا ہے اس آدمی نے ہم سے خیانت کی ہے۔ آپ نے مزید جانچ پڑتال کے لیے حارث

نامی ایک شخص کو سو دینار دیے اور فرمایا: ''مہمان بن کر عمیر کے ہاں جاؤ۔'' گھر میں کھانے پینے کی وافر اشیا اور دیگر ساز و سامان نظر آئے تو آ کر مجھے بتانا۔ لیکن اگر تم دیکھو کہ صاحب خانہ تنگدستی کا شکار ہے تو یہ سو دینار اسے دے آنا۔''

حارث سو دینار ہمراہ لیے روانہ ہوا۔ عمیر کے ہاں پہنچا تو وہ گھر کے باہر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ حارث نے جا کر سلام کیا۔ عمیر نے خیر مقدم کیا اور کہا کہ آیئے، تشریف لایئے۔ کہیے، کہاں سے آنا ہوا۔

''مدینہ منورہ سے آیا ہوں۔'' حارث نے جواب دیا۔

''اچھا تو مسلمانوں کا مزاج کیسا ہے؟''

''بہت اچھا۔''

''امیر المومنین کیسے ہیں؟''

''وہ بھی اچھے خاصے ہیں۔''

''یا اللہ! عمر کی مدد کرنا۔ جہاں تک میں جانتا ہوں، وہ تجھ سے بے حد محبت کرتا ہے۔'' عمیر نے رقت آمیز لہجے میں دعا کی۔

حارث ان کے ہاں تین دن مہمان رہا۔ گھر میں کھانے کو جو کی فقط ایک بڑی روٹی تھی۔ وہ بھی زیادہ تر حارث کو دی جاتی اور خود اہلِ خانہ تھوڑی بہت روٹی پر گزارہ کرتے۔ بارے نوبت فاقوں تک پہنچی۔ چوتھے روز عمیر نے حارث سے ملتجیانہ کہا:

''نوبت فاقوں تک پہنچی۔ اب آپ تشریف لے جائیں تو بہت بہتر ہو۔''

حارث نے دینار نکالے اور عمیر کو دیتے ہوئے کہا:

''یہ اشرفیاں امیر المومنین نے مجھے آپ کے لیے دی تھیں۔ انھیں کام میں لایئے۔''

"نہیں۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں۔ انھیں واپس لے جائیے۔"

عمیر بن سعد نے بے چون و چرا کہا۔

ان کی اہلیہ نے کہا: "رکھ لیجیے نا۔ ضرورت نہ پڑی تو صدقہ کر دیجیے گا۔"

وہ بولے: "لے تو لوں لیکن ان سو اشرفیوں کو رکھوں کہاں؟"

اہلیہ نے قمیص کا دامن پھاڑ کر دیا۔ انھوں نے وہ تمام اشرفیاں اس چیتھڑے میں باندھیں، باہر نکلے اور شہداء کے گھروں اور فقیروں میں بانٹ آئے۔ امیر المومنین کے قاصد کو گمان تھا کہ چند اشرفیاں اسے بھی عطا ہوں گی۔ لیکن عمیر نے اسے کچھ نہیں دیا اور کہا کہ امیر المومنین کو میرا سلام کہیے گا۔ حارث واپس مدینہ منورہ آیا تو امیر المومنین نے اس سے دریافت کیا کہ کہو، کیا خبر لائے ہو۔

"امیر المومنین! بڑے مشکل حالات دیکھ کر آیا ہوں۔" حارث نے جواباً عرض کیا۔

پوچھا: "ابن سعد نے اشرفیوں کا کیا کیا؟"

حارث نے کہا کہ یہ تو مجھے نہیں پتہ۔

امیر المومنین نے عمیر کو لکھا کہ خط ملتے ہی چلے آئیے۔ وہ آئے تو آپ نے دریافت کیا کہ اشرفیوں کا کیا کیا۔ انھوں نے کہا کہ اشرفیوں کا میں نے جو کیا سو کیا، آپ کو اس سے کیا مطلب؟! فرمایا: میں تم کو قسم دیتا ہوں کہ مجھے بتاؤ، تم نے اشرفیوں کا کیا کیا۔ وہ بولے میں نے انھیں اپنے لیے آگے بھیج دیا ہے۔ فرمایا: اللہ تم پر رحم کرے۔

خازن سے کہا کہ اسے کچھ غلہ اور دو کپڑے دے دو۔

عمیر بن سعد نے عرض کیا کہ غلے کی تو مجھے ضرورت نہیں، البتہ کپڑے لے لیتا ہوں کہ میری اہلیہ کے پاس پہننے کو کچھ نہیں۔ گھر میں دو ٹوپے جو کے موجود ہیں۔ جب

تک وہ ختم ہوں گے، اللہ تعالیٰ اور رزق کا بندوبست کردے گا، چنانچہ انھوں نے کپڑے لیے اور گھر کو روانہ ہو گئے۔ [1]

امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ملک شام کے دورے پر گئے تو شام کے والی حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ نے بہت بڑے شاہانہ جلوس کے ہمراہ ان کا استقبال کیا۔ امیر المومنین کے قریب آتے ہی وہ سواری سے اترے اور سلام خلافت پیش کیا۔ امیر المومنین کو ان کا یہ تزک و احتشام گویا ناگوار گزرا۔ سلام کا جواب دیے بغیر آگے بڑھ گئے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ دیوانہ وار پیچھے دوڑے۔ امیر المومنین چلتے چلے گئے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ برابر برابر دوڑے جاتے تھے۔ بارے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے التجا کی کہ یا امیر المومنین! آدمی بیچارا دوڑ دوڑ کر تھک گیا ہے۔ اِس کی بات سن لیجیے۔

فوراً ٹھہر گئے۔ پلٹ کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی جانب دیکھا اور فرمایا:

"شاہانہ جلوس تمھارا ہی ہے؟"

"جی ہاں۔" حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔

"گھر کے دروازوں پر خیر سے دربان بھی بٹھا رکھے ہیں۔ ضرورت مند افراد تو بیچارے دروازے تک ہی پہنچ پاتے ہوں گے۔" امیر المومنین نے قدرے طنزیہ کہا۔

"جی ہاں۔" حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے نیاز مندانہ عرض کیا۔

"لیکن کیوں؟" خلیفۂ ثانی نے خاصے تعجب سے پوچھا۔

"اس لیے کہ ہمارے ملک میں دشمن کے جاسوس پھرتے رہتے ہیں۔ وہ دشمن کو پل پل کی خبر پہنچاتے ہیں۔ اگر ہم یہ تمام اہتمام نہ کریں تو دشمن ہمیں حقیر جانے اور ہم

[1] حلية الأولياء: 1/247-250.

پر دھاوا کرے۔ دروازوں پر دربان نہ بٹھائیں تو بد ذاتوں کو جرأت ملے۔ اِس پر بھی میں آپ کا مقرر کردہ عامل ہوں۔ آپ مجھے کوئی چیز گھٹانے کو کہیں گے تو گھٹادوں گا۔ کوئی چیز بڑھانے کو کہیں گے تو بڑھا دوں گا۔ کہیں توقف کرنے کو کہیں گے تو حسب ارشاد توقف کروں گا۔'' حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے مفصل وجہ بیان کی۔

فرمایا: ''میں نے تم سے جو بھی سوال کیا، تم اس کے نرغے سے صاف نکل گئے۔ اگر تم سچ کہتے ہو تو یہ دانش مند آدمی کی صوابدید کا کرشمہ ہے۔ اگر جھوٹ کہتے ہو تو یہ چالاک آدمی کا دغا وفریب ہے۔ میں تمھیں اس تمام اہتمام کا نہ تو حکم دیتا ہوں نہ اس سے منع کرتا ہوں۔''[1]

معلوم ہوا کہ امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی توجہ عوام کی فلاح و بہبود پر مرکوز رہتی تھی۔ ان کی اولین ترجیح یہی ہوتی تھی کہ عوام کی بنیادی ضروریات پوری ہوں۔ اس سلسلے میں وہ کوئی کوتاہی برداشت نہیں کرتے تھے۔ اگر کوئی عامل یا عہدیدار کوتاہی کرتا تو سختی سے باز پرس کرتے اور معقول وجہ نہ پاتے تو سزا بھی دیتے تھے۔

اہلِ خانہ کے درمیان

اہلِ خانہ کے ساتھ ان کا رویہ بڑا مشفقانہ و ہمدردانہ تھا۔ اپنی اہلیاؤں سے ان کا سلوک بڑا کریمانہ تھا۔ اس سلسلے میں وہ نہایت وسعت ظرفی کا مظاہرہ کرتے تھے۔

ایک مرتبہ ایک صاحب اپنی اہلیہ کی بدسلوکی اور سوئے اخلاق کا شکوہ کرنے حاضر خدمت ہوئے۔ دروازے پر کھڑے انتظار کرنے لگے کہ باہر تشریف لاتے ہیں تو شکایت پیش کرتا ہوں۔ اتنے میں انھیں آپ کی اہلیہ محترمہ کی آواز سنائی دی جو بے طرح برس

[1] فضل الخطاب في سيرة ابن الخطاب: 364/1.

رہی تھیں اور خلیفہ وقت خاموش بیٹھے سن رہے تھے۔ ان صاحب نے سوچا کہ جب خود امیر المومنین کا یہ حال ہے کہ انھیں بھی اہل خانہ کی جھڑکیاں سننی پڑتی ہیں تو مجھے اپنے حال پر تعجب نہیں کرنا چاہیے۔ پلٹنے ہی والے تھے کہ حضرت خلیفہ باہر تشریف لائے۔ پوچھا کیا بات ہے۔ وہ صاحب بولے یا امیر المومنین! آیا تو تھا اپنی اہلیہ کی بدسلوکی اور زبان درازی کی شکایت کرنے لیکن جب آپ کے دروازے پر آیا اور آپ کی اہلیہ کو آپ پر برستے سنا تو سوچا کہ جو آدمی خود اسی مصیبت میں مبتلا ہے وہ میری کیا یاوری کرے گا، اس لیے اب واپس جاتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: مجھ پر میری اہلیہ کے کچھ حقوق ہیں، انھی کا پاس ہے جو اس کی جلی کٹی بھی سن لیتا ہوں۔[1]

وہ اپنے مقرر کردہ والیوں اور عہدیداروں کو بھی ایسا ہی دیکھنا چاہتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے ایک آدمی کے لیے اپنے منیم سے پروانۂ وزارت لکھنے کو کہا۔ میر منشی پروانۂ وزارت لکھ رہا تھا کہ ایک بچہ آیا اور حضرت خلیفہ کی گود میں بیٹھ گیا۔ آپ نے اسے پیار کیا اور چُمکارا۔ وہ آدمی جس کے لیے پروانۂ وزارت لکھا جا رہا تھا، کہنے لگا یا امیر المومنین! میرے دس بچے ہیں لیکن آج تک کوئی بچہ میرے قریب نہیں پھٹکا۔ فرمایا اگر اللہ نے تمھارے کلیجے سے رحم نکال ڈالا ہے تو اس میں میرا کیا قصور؟! اللہ تعالیٰ اُنھی انسانوں پر رحم کرتا ہے جو دوسروں پر رحم کرتے ہیں!

منیم سے فرمایا تحریر چاک کردو۔ جو آدمی اپنی اولاد پر رحم نہیں کھاتا وہ رعایا پر خاک مہربانی کرے گا![2]

بنوکنانہ کا ایک جنگ آزما کلاب بن امیہ ایک معرکے میں شریک تھا۔ اس کے

[1] نور الأبصار:5700. [2] عبقرية عمر لعباس محمود العقاد.

بوڑھے والد کو اس سے ملنے کا اور اسے دیکھنے کا اشتیاق ہوا۔ وہ اس کے غم میں بے قرار رہنے لگا۔ کلاب کے بھائیوں نے امیرالمومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں التجا کی کہ کلاب کو واپس بلا لیجیے۔ اس کا بوڑھا والد بے حد پریشان ہے۔ امیرالمومنین نے سپہ سالار کو لکھا کہ کلاب بن امیہ کو واپس بھیج دیجیے۔ کلاب واپس آیا تو امیرالمومنین کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ اپنے والد سے تم کیا سلوک کرتے تھے جو وہ تمھارے لیے اس قدر پریشان اور بے قرار ہے۔ وہ بولا میں اپنے والد کی تمام ضروریات کا خیال رکھتا تھا۔ اونٹنی کا تازہ دودھ دوہ کر انھیں پلاتا تھا۔

امیرالمومنین نے اس کے والد امیہ کو بلا بھیجا۔ وہ بیچارا بڑا بوڑھا، کمر جھکی ہوئی، نظر بے حد کمزور۔ لاٹھی کے سہارے بمشکل ڈولتا ہوا آیا۔ فرمایا: ''کہو، ابوکلاب کیسے ہو؟''

وہ بولا: ''یا امیرالمومنین! ویسا ہی جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں۔''

آپ نے دودھ کا وہ پیالہ منگایا جس میں کلاب نے دودھ دوہا تھا۔ بوڑھے کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس نے پیالہ منہ کے قریب کیا تو بولا: ''یا امیرالمومنین! اس پیالے سے کلاب کے ہاتھوں کی خوشبو آرہی ہے۔''

امیرالمومنین نے کلاب کو روبرو بلایا اور بوڑھے سے کہا:

''یہ دیکھو۔ یہ ہے کلاب۔ تمھاری خاطر ہم نے اسے واپس بلا لیا ہے۔''

یہ سنتے ہی بوڑھا مارے حیرانی اور خوشی کے اچھل کر کھڑا ہوا اور بیٹے کو سینے سے لگا لیا۔ وہ زار زار روتا تھا۔ باپ بیٹے کی ملاقات کا جذباتی منظر دیکھ کر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی مارے رِقت کے رو دیے۔ امیرالمومنین کو روتا دیکھ کر تمام حاضرین بھی رونے لگے۔ آپ نے کلاب کو حکم دیا کہ جب تک تمھارے والدین بقید حیات ہیں، تم

انھی کی خدمت کرو، بطور مجاہد تمھیں تمھارا وظیفہ برابر ملتا رہے گا۔ [1]

بچوں سے ان کی شفقت کا ایک واقعہ سنان بن سلمہ رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے۔ یہ ان کے بچپن کا واقعہ ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ایک روز میں دیگر بچوں کے ساتھ مل کر ٹپکے کی کھجوریں چن رہا تھا۔ اتنے میں امیرالمومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ادھر آ نکلے۔ بچے انھیں دیکھتے ہی بھاگ کھڑے ہوئے لیکن میں اپنی جگہ کھڑا رہا اور بھاگا نہیں۔ عمر بن خطاب قریب آئے تو میں نے جلدی سے کہا: ''یاامیرالمومنین! یہ تو ٹپکے کی کھجوریں ہیں۔'' فرمایا: ''مجھے دکھاؤ۔ ٹپکے کی ہوئیں تو مجھے بھی نظر آ جائیں گی۔''

جھولی میں جھانک کر دیکھا تو کہا: ''تم نے سچ کہا۔''

دوسرے بچے جو بھاگ کر دور چلے گئے تھے، میں نے ان کی جانب اشارہ کر کے کہا: ''یا امیرالمومنین! انھیں دیکھیے، آپ کے جاتے ہی وہ مجھ پر حملہ آور ہوں گے اور میری تمام کھجوریں ہتھیا لیں گے۔'' میری بات سن کر امیرالمومنین مسکرائے اور مجھے میرے گھر چھوڑ گئے۔ [2]

اِس خوش اخلاقی اور رحمدلی کے باوجود دو خواتین نے ان کی طرف سے شادی کی پیشکش ٹھکرا دی تھی۔ ایک خاتون نے ان کے متعلق کہا تھا کہ ان کی زندگی خشک و سادہ ہے اور وہ عورتوں کے معاملے میں سخت گیر واقع ہوئے ہیں۔ دوسری نے کہا تھا: وہ آخرت کے معاملے میں ایسے کھوئے ہیں کہ دنیا کے معاملات سے یکسر بیگانہ ہو گئے ہیں۔ پہلی خاتون حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی دختر ام کلثوم رضی اللہ عنہا تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی بہن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ان کا ہاتھ مانگا تھا۔ ام المومنین نے اپنی بہن

---

[1] عبقرية عمرلعباس محمود العقاد . [2] عبقرية عمر لعباس محمود العقاد .

سے اس رشتے کا ذکر کیا تو انھوں نے انکار کر دیا اور کہا: مجھے ان سے شادی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ڈانٹ پلائی: ''امیر المومنین کو ٹھکراؤ گی؟''

ام کلثوم رضی اللہ عنہا نے جواب دیا: ''ہاں کیونکہ ان کی زندگی خشک و سادہ ہے اور وہ عورتوں کے معاملے میں بہت سخت گیر ہیں۔''

دوسری خاتون تھیں، ام ابان بنت عتبہ بن ربیعہ رضی اللہ عنہا۔ ان سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے رشتے کا ذکر کیا گیا تو انھوں نے انکار کرتے ہوئے کہا: ''آخرت کے معاملے میں وہ ایسے کھوئے ہیں کہ دنیا کے معاملات سے یکسر بیگانہ ہو گئے ہیں۔ وہ تو گویا اللہ تعالیٰ کو دونوں آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔''[1]

ان کی سخت گیری اور تندخوئی کا جو شہرہ تھا، اس کی تہ میں دراصل یہی بات تھی۔ وہ حق بات کے ماننے اور اس کے منوانے میں سخت گیر تھے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا وہ کسی سے نہیں ڈرتے تھے۔ مسلمانوں کے روپے پیسے کے سلسلے میں وہ حد سے زیادہ محتاط تھے۔ ان کی پائی پائی کا حساب رکھتے اور روپیہ پیسہ مستحق افراد پر خرچ کرتے۔ ان کے تحت کام کرنے والے سرکاری افسران بھی عوام کا روپیہ پیسہ بڑی احتیاط سے خرچ کرتے تھے کیونکہ انھوں نے خلیفۂ وقت کو اس سلسلے میں غیر معمولی احتیاط برتتے دیکھا تھا۔

ایک دفعہ اپنے تمام اہل خانہ کو بلایا اور فرمایا: ''میں نے فلاں اور فلاں بات سے لوگوں کو منع کیا ہے۔ اور لوگ تمھاری طرف یوں دیکھتے ہیں جیسے عقاب گوشت کے ٹکڑے کی طرف دیکھتا ہے۔ تم گناہ میں پڑے تو لوگ بھی پڑے اور تم گناہ سے بچے تو

[1] عبقرية عمر لعباس محمود العقاد.

لوگ بھی بچے، تم میں سے کوئی آدمی اس بات میں پڑا جس سے میں نے منع کیا ہے تو بخدا! میں اپنا قریبی ہونے کی وجہ سے اسے دوہری سزا دوں گا۔ اب جس کا دل چاہے، اقدام کرے اور جس کا دل چاہے، دو قدم پیچھے ہٹ جائے۔''

یہ تھے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جو سب سے پیشتر اپنے اہل خانہ اور عزیز و اقارب کے لیے رول ماڈل تھے، پھر رعایا کے لیے۔ ان کے اہل خانہ یا عزیز و اقارب میں سے کوئی غلطی کرتا تو وہ زیادہ سختی سے باز پُرس کرتے۔ اس سلسلے کا ایک واقعہ مصر پر مامور ان کے عامل حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے۔ ایک دفعہ وہ دوستوں کی محفل میں تشریف فرما تھے کہ باتوں باتوں میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا ذکر چھڑا۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ عمر پر رحم فرمائے۔ اللہ کے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کے بعد میں نے ان سے بڑھ کر اللہ سے ڈرنے والا اور کوئی آدمی نہیں دیکھا۔ کوتاہی بیٹے سے ہوتی یا باپ سے، وہ اللہ کے معاملے میں کسی کا لحاظ نہیں کرتے تھے۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے مزید کہا کہ میں ایک روز مصر میں اپنے مکان پر تھا کہ میرا خادم آیا اور بولا: ''عبدالرحمٰن بن عمر بن خطاب اور ابوسروعہ آئے ہیں۔ اندر آنے کی اجازت چاہتے ہیں۔'' میں نے کہا: ''ٹھیک ہے۔ انھیں اندر لے آؤ۔''

وہ اندر آئے تو بہت مرجھائے ہوئے تھے۔ بولے: ''ہم پر اللہ کی حد قائم کریے کیونکہ رات کو ہم نے اتنی شراب پی کہ نشے میں جھومنے لگے تھے۔''

میں نے ان دونوں کو ڈانٹ ڈپٹ کی اور کہا: دفع ہو جاؤ۔ آئندہ ایسا مت کرنا۔ عبدالرحمٰن بن عمر بن خطاب نے کہا کہ اگر آپ حد قائم نہیں کریں گے تو میں جب مدینہ جاؤں گا، اپنے والد کو بتاؤں گا۔ میں نے سوچا اگر میں نے اس پر حد قائم نہ کی اور اس

نے عمر کو بتا دیا تو وہ مجھ سے سخت ناراض ہوں گے اور عجب نہیں کہ معزول ہی کر ڈالیں۔ میں ان دونوں کو گھر کے آنگن میں لے گیا اور ان کے حد لگائی۔ حد لگوانے کے بعد عبدالرحمٰن بن عمر بن خطاب رحمہ اللہ آنگن کے ایک گوشے میں جا بیٹھا اور اپنا سر مونڈ ڈالا۔ ان کے ہاں حدود قائم کرنے کے ساتھ سر مونڈنے کی بھی روایت تھی۔ میں نے اس واقعے کے متعلق عمر کو ایک حرف بھی نہیں لکھا کہ ان کا خط آ گیا جس میں مرقوم تھا:

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اللہ کے بندے عمر کی طرف سے، عاصی (گناہ گار) بن عاص کے نام۔ ابن عاص! مجھے تم پر، تمھاری جرأت پر اور تمھاری طرف سے میرے عہد کی خلاف ورزی پر بہت تعجب ہوا۔ معلوم ہوتا ہے، میں تمھیں معزول کر کے رہوں گا۔ تم نے اپنے گھر میں عبدالرحمٰن کے حد لگائی۔ اپنے گھر میں ہی اس کا سر مونڈا۔ حالانکہ تم جانتے تھے، یہ میرے عہد کی خلاف ورزی ہے۔ عبدالرحمٰن تمھاری رعایا کا عام آدمی ہی تو ہے۔ تم اس سے بھی وہی سلوک کرتے جو دوسرے مسلمانوں سے روا رکھتے ہو لیکن تم نے کہا ہو گا کہ وہ امیر المومنین کا لڑکا ہے حالانکہ تم بخوبی جانتے تھے کہ الٰہی حق کی ادائیگی کے سلسلے میں، میں کسی کی پروا نہیں کرتا۔ تمھیں جونہی میرا خط ملے، عبدالرحمٰن کو شلوکا پہنا، چھوٹے پالان پر بٹھا، روانہ کر دو تا کہ اسے پتہ چلے کہ اس نے کیا ارتکاب کیا ہے۔''

میں نے حسبِ ارشاد عبدالرحمٰن کو روانہ کر دیا۔ عمر کو ایک خط بھی لکھا جس میں یہ صفائی پیش کی کہ میں نے عبدالرحمٰن کو گھر کے آنگن میں ہی کیوں سزا دی۔ میں نے عرض کیا کہ بخدا ذمی ہو یا مسلمان، سبھی مجرموں پر گھر کے آنگن میں حد جاری کرتا ہوں۔ وہ خط میں نے عبداللہ بن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ہاتھ روانہ کیا۔ عبدالرحمٰن مدینہ

پہنچا اور اپنے والد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے وہی شلوکا پہن رکھا تھا۔ چھوٹے پالان نے اُسے اتنا تھکا مارا تھا کہ اس سے چلا نہیں جاتا تھا۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے گوشمالی کی: ''عبدالرحمٰن! تم خطا پہ خطا کرتے ہو۔''

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے مداخلت کی: ''یا امیرالمومنین! جانے دیجیے۔ اس کے حد لگ چکی ہے۔''

انھوں نے ابن عوف رضی اللہ عنہ کی بات پر مطلق دھیان نہیں دیا اور عبدالرحمٰن کو برابر زدو کوب کرتے رہے۔ عبدالرحمٰن بھی چلایا: ''میں بیمار ہوں اور آپ مجھے مار کر دم لیں گے۔'' وہ اس پر بھی مارتے رہے۔ بعد ازاں اسے قید کر دیا۔ وہ شدید بیمار پڑا اور بالآخر وفات پا گیا۔[1]

صاحب عبقریات نے اس واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حدیں نافذ کرنے کی جلدی نہیں ہوا کرتی تھی نہ وہ اس سلسلے میں بے صبری سے کام لیتے تھے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ملزم کو نفاذ حد سے بچانے کی ذرا سی بھی گنجائش نکل رہی تھی، پھر بھی انھوں نے حد جاری کر دی۔ حدیں نافذ کرنے سے پہلے وہ ہمیشہ بڑی سوچ بچار کرتے تھے۔ ان کی ترجیح یہی ہوتی تھی کہ شک و شبہ کی بنیاد پر حد نافذ کرنے کے بجائے شک و شبہ کو حد کے معطل کرنے کی بنیاد بنائیں۔''

نفاذِ حد میں انتہا پسندی پر بھی ناراضگی کا اظہار کرتے تھے۔ ان کے عامل حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے ایک شرابی کے کوڑے تو لگائے ہی، اس کا سر بھی منڈوا ڈالا،

[1] المنتظم لابن الجوزي، ص: 207.

چہرے پر سیاہی پھروا دی اور اعلان کر دیا کہ کوئی آدمی اس کے پاس نہ بیٹھے اور نہ اس کے ساتھ کھانا کھائے۔ آپ کو پتہ چلا تو سخت ناراض ہوئے۔ اس آدمی کو جس کا یہ حشر کیا گیا تھا، دو سو درہم عنایت کیے اور ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ آئندہ اگر تم نے ایسا کیا تو میں تمھارے چہرے پر کالک مل کر تمھیں لوگوں میں گھماؤں گا۔ آپ نے انھیں حکم دیا کہ لوگوں سے کہو، اس کے پاس بیٹھا کریں اور اس کے ساتھ مل کر کھانا کھایا کریں۔ آپ نے ان سے یہ بھی فرمایا کہ شرابی کو توبہ کرنے کی مہلت دو۔ اگر وہ توبہ کرلیتا ہے تو اس کی گواہی بھی مقبول قرار دو۔

ایک اور آدمی کے متعلق آپ کو پتہ چلا کہ وہ شراب پیتا ہے۔ آپ نے اسے نصیحت کی تو وہ تائب ہوگیا۔ آپ نے حاضرین محفل سے فرمایا کہ جب تم اپنے کسی بھائی کو دیکھو کہ اس نے غلطی کی ہے تو اسے سیدھے راستے پر ڈالو اور سیدھے راستے پر چلنے میں اس کی مدد کرو۔ نیز اللہ سے دعا کرو کہ وہ تائب ہو جائے۔ اس کے خلاف شیطان کے ممد ومعاون مت بنو۔

عبدالرحمٰن کو زدوکوب کرنے کا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا کہ وہ لوگوں کو دکھائیں، دیکھو جیسے دوسروں کو مارتا ہوں، اپنے بیٹے کو بھی مار رہا ہوں۔ وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ ان کی اولاد اسلامی تعلیمات کی خلاف ورزی نہ کرے۔ اسلامی معاشرے میں انھیں محض اس وجہ سے امتیازی حیثیت حاصل نہ رہے کہ وہ خلیفہ کے بیٹے ہیں۔ خلیفہ کے بیٹے ہونے کی بنا پر وہ ایسا کوئی فائدہ نہ اٹھا پائیں جو دوسرے مسلمانوں کو حاصل نہیں۔ لیکن اگر ایسا ہوتا ہے تو وہ نہایت سختی سے آڑے آتے ہیں اور رعایا کے حقوق کی ادائیگی کے سلسلے میں ذرہ بھر کوتاہی نہیں برتتے۔

ان کے لائق فرزند حضرت عبداللہ بن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما کا بیان ہے:

''میں نے چند اونٹ خریدے اور انھیں چراگاہ میں چھوڑ دیا۔ وہ خوب موٹے تازے ہوگئے تو انھیں بازار لے آیا۔ عمر رضی اللہ عنہ بازار میں آئے۔ پلے پلائے اونٹ دیکھے تو دریافت فرمایا: ''یہ اونٹ کس کے ہیں؟''

لوگوں نے بتایا کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے۔

فرمایا: ''واہ واہ، امیر المومنین کے بیٹے عبداللہ کے!''

میں بھی وہیں قریب ہی تھا۔ کسی نے بتایا تو دوڑا آیا اور عرض کیا: ''یا امیر المومنین! کیا آپ نے مجھے یاد فرمایا؟''

فرمایا: ''یہ اونٹ کہاں سے آئے؟''

عرض کیا: ''دبلے پتلے اونٹ تھے۔ میں نے انھیں خریدا اور چراگاہ میں بھیج دیا۔ دوسروں کی طرح میں بھی ان سے منافع کمانا چاہتا ہوں۔''

فرمایا: ''ہاں بھئی! کیوں نہیں! تمھارے اونٹوں کی تو چراگاہ میں خوب آؤ بھگت ہوئی ہوگی۔ ارے! امیر المومنین کے بیٹے کے اونٹ ہیں۔ انھیں اچھی طرح چراؤ۔ ارے! ہٹو! ہٹو! امیر المومنین کے بیٹے کے اونٹ آئے ہیں، انھیں پانی پلاؤ۔''

پھر فرمایا: ''عمر کے بیٹے عبداللہ! یہ اونٹ بیچ کر اپنا سرمایہ لو اور منافع بیت المال میں جمع کرادو۔''[1]

اسلم کی روایت سے ایک اور واقعہ سنیے۔ عمر کے بیٹے عبداللہ اور عبیداللہ ایک لشکر میں شامل ہوکر عراق روانہ ہوئے۔ واپسی پر دونوں ابوموسیٰ اشعری کے ہاں گئے جوان

---

[1] أخبار عمر لعلي الطنطاوي، ص: 313، بحواله الرياض النضرة: 2/47.

دِنوں بصرہ کے امیر تھے۔ ابوموسیٰ اشعری نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور کہا: ''اگر میرے بس میں ہوا کہ آپ دونوں کو کوئی فائدہ پہنچا سکوں تو میں ایسا ضرور کروں گا۔''

پھر جیسے اُنھیں کچھ یاد آیا۔ بولے: ''ارے ہاں! یہاں زکاۃ کا کچھ روپیہ پڑا ہے جو میں امیر المومنین کی خدمت میں ارسال کرنا چاہتا ہوں۔ میں وہ روپیہ آپ کو قرض دے دیتا ہوں۔ آپ اس روپے سے عراقی مصنوعات خریدیے اور مدینہ میں جا کر بیچ دیجیے۔ اصل سرمایہ امیر المومنین کی خدمت میں پیش کریے اور منافع خود رکھ لیجیے۔''

دونوں نے اس تجویز پر صاد کیا اور زکاۃ کا روپیہ لے کر عراقی مصنوعات خرید لیں۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو لکھ بھیجا کہ آپ عبداللہ اور عبیداللہ سے زکاۃ کی رقم وصول کر لیجیے گا۔ وہ دونوں مدینہ پہنچے تو امیر المومنین نے دریافت کیا کہ کیا ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے تمھاری طرح تمام لشکر کو قرض دیا تھا۔ اُن دونوں نے نفی میں جواب دیا۔ اس پر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اصل سرمایہ بھی دو اور تمام منافع بھی میرے حوالے کرو۔ عبداللہ تو خاموش رہے۔ عبیداللہ نے عرض کیا:

''امیر المومنین! آپ کا یہ مطالبہ درست نہیں۔ روپیہ تلف ہوجاتا یا کم ہوجاتا تو ہم ضامن تھے۔''

امیر المومنین نے اِس پر بھی حکم دیا کہ تمام روپیہ میرے حوالے کرو۔ اب کے بھی عبداللہ خاموش رہے اور عبیداللہ نے بحث تکرار کی۔ امیر المومنین کے ایک مصاحب وہیں موجود تھے۔ انھوں نے عرض کیا: ''یا امیر المومنین! آپ اِس سودے کو شراکت داری میں کیوں نہیں بدل لیتے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ شراکت داری ہی سہی۔"

امیرالمومنین نے زکاۃ کی اصل رقم اور آدھا منافع لیا اور بیت المال میں جمع کرا دیا۔ عبداللہ اور عبیداللہ دونوں نے آدھا منافع وصول کیا۔ [11]

زکاۃ وصدقات کے روپیہ کے متعلق خلیفۂ ثانی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی شدتِ احتیاط کا یہ عالم تھا کہ بیٹوں سے بھی یہ سوال کیا:

"کیا ابوموسیٰ نے تمھاری طرح تمام لشکر کو قرض دیا تھا؟"

یعنی اگر اس نے صرف تم دونوں کو قرض دیا تھا تو گویا اس نے تم سے امتیازی سلوک کیا۔ اور یہ امتیازی سلوک محض اس لیے کیا کہ تم دونوں امیرالمومنین کے بیٹے ہو۔ تم دونوں کو زکاۃ کا روپیہ قرض دینے کی بنیاد اگر یہی ہے اور سو فیصد یہی ہے تو عمر کے ہوتے ہوئے ایسا نہیں ہوسکتا۔ عمر کے ہوتے ہوئے تم دونوں اس امتیازی سلوک سے ہرگز فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ یوں اقربا پروری کی تو گویا جڑ کاٹ کر رکھ دی۔ امیرالمومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا طرزِ حکومت یہی تھا۔ خلیفہ بننے کے بعد وہ تاحیات اِسی روش پر چلتے رہے۔

ایک مرتبہ شاہِ روم کا ایلچی خط لے کر مدینہ میں حاضر خدمت ہوا۔ آپ کی اہلیہ محترمہ نے کہیں سے ایک دینار قرض لیا، عطر خریدا، اسے ننھی بوتلوں میں بھرا اور ایلچی کے ہاتھ ملکۂ روم کو بھیج دیا۔ ملکۂ روم نے ان ننھی بوتلوں میں سے عطر نکالا اور ان میں ہیرے جواہر بھر کر ان کو واپس بھیج دیا۔ خلیفۂ ثانی کی اہلیہ کو وہ ننھی بوتلیں موصول ہوئیں تو انھوں نے ان کو گھر میں پڑے قالین پر الٹ دیا کہ دیکھیں تو، بدلے کے طور پر اُن

[11] أخبار عمر لعلي الطنطاوي، ص: 314.

میں کیا آیا ہے۔ ہیرے جواہر پورے قالین پر اوس کے قطروں کی طرح پھیل گئے۔ اتنے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ گھر کے اندر تشریف لائے۔ قالین پر ہیرے جواہر بکھرے پڑے تھے۔ پوچھا: یہ کیا ہے؟ اہلیہ نے تمام ماجرا کہہ سنایا کہ میں نے ایک دینار کا عطر بھیجا تھا۔ یہ تمام ہیرے جواہر اسی کے عوض آئے ہیں۔ انھوں نے وہ تمام جواہرات اکٹھے کیے۔ انھیں فروخت کیا۔ اہلیہ کا ایک دینار اس کے حوالے کیا اور بقیہ روپیہ بیت المال میں جمع کرا دیا۔ ہیرے جواہر کے وہ تحائف امیر المومنین کی اہلیہ کے نام پر آئے تھے۔ کسی عام آدمی کی اہلیہ ہوتی تو اس کے نام وہ تحائف نہ آتے۔

امیر المومنین اور ان کی اہلیہ اس معاملے میں عام مسلمانوں سے بڑھ کر نہیں تھے۔ انھیں کوئی حق نہیں پہنچتا تھا کہ جو شے عام مسلمانوں کو نہیں ملتی، ان کو میسر آئے۔ یوں ضروری تھا کہ وہ ہیرے جواہر مسلمانوں کے عام سرمائے میں شامل ہوتے۔ امیر المومنین نے وہ تمام ہیرے جواہر بیت المال میں جمع کرا دیے۔ یوں وہ مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت میں آ گئے۔ اس سلسلے میں انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ عمل اختیار کیا تھا۔ حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ ازد کے ایک آدمی ابن لُتبیة کو بنوسلیم کی زکاۃ اکٹھی کرنے پر مامور کیا۔ وہ زکاۃ کا مال لے کر آیا تو چند اشیا اپنے پاس رکھ لیں اور کہا کہ یہ چیزیں مجھے تحفے میں ملی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو طیش آ گیا۔ فرمایا: ”اگر تم سچے ہو تو اپنے باپ اور اپنی ماں کے گھر میں ہی کیوں نہ بیٹھے رہے کہ یہ تحفے تمھیں وہاں ملتے۔“

بعد ازاں آپ نے مسلمانوں کو خطاب کیا اور حمد وثنا کے بعد فرمایا:

”میں آپ میں سے آدمی کو (زکاۃ اکٹھی کرنے کے) کام پر مامور کرتا ہوں۔

وہ (کام انجام دے کر) آتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ رہا آپ کا مال اور یہ ہے تحفہ جو مجھے دیا گیا ہے۔ اگر وہ (اس بات میں) سچا ہے (کہ وہ تحفہ اُسی کو دیا گیا ہے) تو وہ اپنے باپ اور اپنی ماں کے گھر میں ہی کیوں نہ بیٹھا رہا کہ وہ تحفہ اسے وہاں ملتا۔ واللہ! آپ میں سے جو کوئی (زکاۃ کے) اِس مال میں سے کوئی شے ناحق لے گا وہ روزِ قیامت اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اس شے کو (کندھوں پر) اٹھائے ہوگا۔'' [1]

اسی قبیل کا ایک اور واقعہ پڑھیے۔ زکاۃ و صدقات میں جو خوشبو آتی تھی، اسے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اپنی اہلیہ کے حوالے کرتے تھے۔ آپ کی اہلیہ خوشبو کو دانتوں سے کاٹ کر اس کے ٹکڑے کرتیں اور بیچ ڈالتیں۔ فروخت ہونے والی خوشبو کی قیمت وہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو لا دیتیں اور وہ اسے بیت المال میں جمع کرا دیتے۔ دانتوں سے کاٹتے وقت تھوڑی بہت خوشبو ان کی انگلیوں کو لگ جاتی جسے وہ دوپٹے سے صاف کرلیتیں۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ایک روز گھر آئے تو انھیں خوشبو آئی۔ دریافت فرمایا: ''یہ خوشبو کیسی ہے؟'' اہلیہ نے بتایا کہ خوشبو کاٹتے ہوئے ہاتھوں کو لگ جاتی ہے جسے وہ دوپٹے سے صاف کرلیتی ہیں۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو اس پر بھی غصہ آیا۔ فرمایا: ''تم مسلمانوں کی خوشبو لگاتی ہو۔'' فوراً اٹھے۔ اہلیہ کے سر پر سے دوپٹہ کھینچا۔ اسے پانی میں بھگویا اور مٹی پر ملا۔ سونگھ کر دیکھا۔ خوشبو آئی۔ پانی میں بھگویا اور دوبارہ مٹی پر ملا۔ کئی بار یہ عمل دہرایا تا آنکہ دوپٹے کی خوشبو غائب ہوگئی۔ [2]

یہ تھے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ۔ یگانۂ روزگار۔ ایسے اہلِ ایمان جن کی رگ رگ

---

[1] صحيح مسلم، حديث: 1832. [2] المنتظم لابن الجوزي، ص: 138.

میں ایمان سمایا تھا۔ جن کی شریانوں میں ایمان خون بن کر دوڑتا تھا۔ ایسے ماہر نفسیات جو نفس کی اچھی بُری کیفیات سے بخوبی واقف تھے۔ ایک روز منادی کرائی کہ تمام لوگ مسجد میں آئیں۔ آپ منبر پر تشریف فرما ہوئے۔ اللہ کی حمد و ثنا بیان کی اور فرمایا: ''صاحبو! ایک وقت وہ بھی تھا کہ بنی مخزوم میں میری جو خالائیں رہتی تھیں، میں ان کے اونٹ بکریاں چراتا اور ان کے لیے میٹھا پانی ڈھوتا تھا۔ اس محنت، مشقت کے عوض مجھے مٹھی بھر کھجوریں یا منقے دیے جاتے تھے۔''

اتنا کہہ کر منبر سے اتر آئے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے عرض کیا: ''امیر المومنین! بھلا یہ کیا بات ہوئی؟''

فرمایا: ''ابن عوف! میرے جی نے مجھ سے اکیلے میں کہا کہ تو امیرالمومنین ہے۔ تیرے اور اللہ کے درمیان آج کسی کی حاکمیت نہیں۔ تجھ سے افضل اور کون ہے! میں نے چاہا کہ اسے اس کی اوقات بتاؤں۔''[1]

منصبِ خلافت پر فائز ہونے کے بعد بھی عرصے تک اپنی معاش کا بندوبست خود کرتے رہے۔ تجارت کا آبائی پیشہ اپنایا تھا۔ لوگوں سے معاملت کرتے تھے۔ قرض لیتے دیتے تھے۔ سامانِ تجارت بیچتے اور نفع پاتے تھے۔ ایک دفعہ شام کے تجارتی سفر پر جانے کے لیے ایک قافلہ تیار کیا۔ چار ہزار درہم کی ضرورت پڑ گئی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی طرف آدمی دوڑایا کہ اس سے لے آؤ۔ انھوں نے کہلا بھیجا کہ بیت المال سے لے لیجیے۔ بعد میں لوٹا دیجیے گا۔ قاصد نے آکر پیغام دیا تو بذات خود ان کی طرف گئے۔ فرمایا: ''تمھی نے کہا ہے کہ بیت المال سے روپیہ لے لو؟! ارے! روپیہ آنے سے پہلے اگر میں مرگیا تو تم لوگ کہو گے کہ یہ روپیہ امیرالمومنین نے لیا تھا،

[1] الطبقات الکبریٰ لابن سعد: 210/1.

جانے دو، معاف کردو۔ تم تو یہ کہہ کر اطمینان سے بیٹھ جاؤ گے۔ قیامت کے دن وہ روپیہ لوٹانا تو مجھی کو پڑے گا۔ اِس لیے میں نے سوچا کہ تم جیسے حریص اور بخیل آدمی سے روپیہ لوں تا کہ اگر میں مر گیا تو تم یہ روپیہ میرے ترکے میں سے وصول کرلو۔''

عرصے بعد جب خلافت کی ذمے داریاں بہت بڑھ گئیں تو ان کا وظیفہ مقرر کیا گیا۔ یہ سوال پیدا ہوا کہ وظیفہ کتنا ہونا چاہیے۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جو آپ کی اور آپ کے اہل وعیال کی ضروریات کے لیے کافی ہو۔ ضرورت سے کم نہ ضرورت سے زیادہ، چنانچہ اسی اصول کے مطابق وظیفہ مقرر کر دیا گیا۔ خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اس کی وضاحت فرمائی: ''اللہ کا روپیہ استعمال کرنے کے سلسلے میں، میں خود کو یتیم کے درجے پر لے آیا ہوں۔ اگر مجھے ضرورت نہ پڑی تو نہیں لوں گا۔ ضرورت پڑی تو اتنا لوں گا جس سے ضرورت پوری ہو جائے۔ جب اپنا روپیہ آئے گا تو وہ بھی لوٹا دیا کروں گا۔''

یہ تھا قرآنِ مجید کا مطلوبہ عہدیدار، قوی (طاقتور) اور امین (امانت دار)۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انھیں ایک مرتبہ سخت گرمی کے موسم میں زکاۃ کے اونٹ چراتے دیکھا تو عرض کیا کہ آپ ناحق تکلیف کرتے ہیں۔ یہ کام کوئی اور بھی کر سکتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انکار کر دیا اور کہا کہ یہ کام مجھی کو کرنا ہے۔ اس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وہاں کھڑے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا: ''جو آدمی (قرآن مجید میں ذکر کردہ) قوی اور امین عہدیدار کا دیدار کرنا چاہتا ہے وہ ان کا (حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا) دیدار کرے۔''

رعایا کی خاطر راتوں کو جاگنا

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ تاجروں کا ایک قافلہ مدینہ میں آیا

اور عیدگاہ میں ٹھہرا۔ عمر نے مجھ سے کہا: ''آج رات چوروں سے ان کا تحفظ کرو گے؟''

میں نے جواب دیا: ''جی ہاں۔''

چنانچہ وہ رات ہم نے جاگ کر گزاری۔ حسبِ توفیق نماز بھی پڑھتے رہے۔ رات کے پہلے پہر عمر نے ایک بچے کے رونے کی آواز سنی۔ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور بچے کی ماں سے فرمایا: ''اللہ سے ڈر اور اپنے بچے سے اچھا سلوک کر۔'' یہ کہہ کر واپس آ گئے۔ تھوڑی دیر میں بچہ پھر رویا۔ دوبارہ گئے اور بچے کی ماں سے کہا: ''اللہ سے ڈر اور اپنے بچے سے اچھا سلوک کر۔'' اتنا کہہ کر پھر واپس چلے آئے۔ رات کے آخری پہر بچہ پھر رویا تو اس کی ماں کے پاس گئے اور فرمایا: ''اری! میں دیکھ رہا ہوں کہ تو بہت بری ماں ہے۔ رات بھر تیرے بچے کو قرار نہیں آیا۔''

وہ بولی: ''اللہ کے بندے! تم نے بھی رات بھر میرا دم ناک میں کیے رکھا۔ میں اس کا دودھ چھڑاتی ہوں لیکن یہ نہیں چھوڑتا۔''

''وہ کاہے کو؟'' عمر نے قدرے حیران ہو کر پوچھا۔

''مائیں جس بچے کا دودھ چھڑا دیتی ہیں، عمر اسی کا وظیفہ مقرر کرتا ہے۔'' اس نے وضاحت سے بتایا۔

پوچھا: ''کتنے ماہ رہ گئے ہیں اس کے دودھ پینے کے؟''

اس نے بتایا کہ چند مہینے باقی ہیں۔ بہت گھبرائے۔ فرمایا: ''تیرا ستیاناس! اسے جلدی میں مت ڈال۔''

فجر کی نماز میں شدت سے روتے رہے۔ زیادہ تر قراءت تو لوگ سن ہی نہیں پائے۔ سلام پھیرا تو کہا: ''ہائے عمر کی بدبختی! اس نے مسلمانوں کے کتنے بچے مار ڈالے!''

اسی وقت منادی کرادی: ''بچوں کا دودھ چھڑانے میں جلدی مت کرو۔ ہم اسلام کے ہر نومولود کا وظیفہ مقرر کرتے ہیں۔''

بعدازاں اس فرمان کی تحریریں ملک کے کونے کونے میں بھجوا دیں۔[1]

ان کے غلام اسلم کی روایت ہے کہ ایک رات ہم عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ) کے ہمراہ گشت کرتے ہوئے میدانِ واقم کی طرف جا نکلے۔ چلتے چلتے صرار میں پہنچے تو دور آگ جلتی دکھائی دی۔ فرمایا: ''اسلم! معلوم ہوتا ہے وہاں کچھ مسافر ٹھہرے ہیں۔ شاید رات اور سخت سردی نے ان کی منزل دور کر دی ہے۔ چلو، چل کر دیکھتے ہیں۔''

ہم بے تحاشا بھاگتے ہوئے ان کے قریب پہنچے تو ایک عورت آگ کے قریب بیٹھی نظر آئی۔ چند بچے بھی اس کے آس پاس بیٹھے تھے۔ ہانڈی چولھے پر چڑھی تھی۔ بچے چیخ چیخ کر رو رہے تھے۔ عمر نے بلند آواز سے کہا:

''السلام علیکم! روشنی والو! (آگ والو کہنا انھیں اچھا معلوم نہیں ہوا۔)''

عورت نے جواباً کہا: ''وعلیکم السلام۔''

''کیا میں قریب آ سکتا ہوں؟'' عمر نے پوچھا۔

''اچھی نیت سے قریب آؤ ورنہ رہنے دو۔'' عورت نے جواب دیا۔

قریب گئے۔ پوچھا: ''کیا بات ہے؟''

وہ بولی: ''رات اور سخت سردی نے منزل پر پہنچنے سے روک دیا ہے۔''

دریافت کیا: ''بچے کیوں چلاتے ہیں؟''

اس نے کہا: ''بھوک کے باعث۔''

[1] الطبقات الکبریٰ لابن سعد: 217/1.

''تو ہانڈی میں کیا ہے؟''

''پانی۔ ان کے بہلانے کو چڑھا رکھی ہے تاکہ یہ سو جائیں۔ ہمارا اور عمر کا فیصلہ اللہ ہی کرے گا۔''

''اللہ تجھ پر رحم کرے۔ عمر کو تمھارے بارے میں کیا معلوم!''

''اچھا!'' عورت نے قدرے ناراض ہو کر کہا۔ ''ہم پر حکومت تو کرتا ہے، پھر ہم سے غافل بھی رہتا ہے۔''

میری طرف متوجہ ہوئے۔ فرمایا: ''چلو، چلتے ہیں۔''

ہم بے تحاشا دوڑتے ہوئے آئے۔ سیدھے دارالدقیق میں پہنچے۔ آٹے کا ایک تھیلا اور تھوڑی چربی نکالی۔ فرمایا: ''یہ سامان مجھ پر لاد دو۔'' عرض کیا: ''میں اٹھائے لیتا ہوں۔'' ڈانٹ کر فرمایا: ''تیری ماں نہ رہے! قیامت کے دن بھی میرا بوجھ تو ہی تو اٹھائے گا۔'' میں نے وہ سامان ان پر لاد دیا۔ بے تحاشا دوڑ پڑے۔ میں بھی دوڑ پڑا۔ وہاں پہنچے۔ سامان رکھا۔ آٹا نکالا اور عورت سے فرمایا:

''تم آٹا چھڑکتی جاؤ۔ میں اسے پکاتا ہوں۔''

ہانڈی تلے پھونک پھونک کر آگ دہکانے لگے۔ میں نے دیکھا، دھواں ان کی ڈاڑھی میں سے نکل رہا تھا۔ کھانا پک گیا تو انھوں نے ہانڈی چولھے پر سے اتاری اور بچوں کی ماں سے فرمایا: ''کوئی برتن لاؤ۔'' وہ پرات لے آئی۔ کھانا اس میں ڈالا اور فرمایا: ''تم بچوں کو کھلاؤ۔ میں کھانا ٹھنڈا کرتا ہوں۔''

بچے کھا پی کر سیر ہو گئے تو بچا ہوا کھانا وہیں چھوڑا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں بھی اٹھ گیا۔ وہ عورت کہنے لگی: ''جزاک اللہ خیر! حکومت کرنے کے لائق امیرالمومنین

نہیں، تم ہو۔“

فرمایا: ”منہ سے اچھے لفظ نکالو۔ جب تم امیر المومنین کے ہاں جاؤ گی تو ان شاء اللہ مجھے بھی وہیں پاؤ گی۔“

یہ تھے رعایا کے امانت دار کفیل! جو رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے دن دیکھتے تھے نہ رات۔ حکمران اگر ایسا نہ ہو تو تصور کریے کہ وہ کیسا ہوگا! حکومت کی ذمے داری دراصل بہت بھاری ذمے داری ہے۔ اس ذمے داری کا بار بڑے آدمی ہی اٹھا پاتے ہیں، جنھیں اللہ تعالیٰ فراخدلی اور وسعت ظرفی کی بیش بہا نعمت سے بہرہ مند کرتا ہے۔ وسعت ظرفی اور دریا دلی ہی کی بدولت وہ لوگوں پر حکومت کرتے، ان کی ضروریات کا خیال رکھتے اور ان کی فلاح و بہبود کے کام کرتے ہیں۔ وہ حکمران جو تخت حکومت پر براجمان ہو کر عیش کرتے اور عوام کے حقوق پامال کرتے ہیں، وہ تو چور اچکے ہوتے ہیں جو لوگوں کو غافل پا کر یا انھیں ورغلا کر تخت حکومت پر قابض ہو جاتے ہیں۔ ایسے حکمران، عوام کو فاقوں میں مبتلا کر کے بلکہ عوام کا پیٹ کاٹ کے اپنے پیٹ کا دوزخ بھرتے اور اپنے خزانوں میں اضافہ کرتے ہیں۔ پتھروں کی سختی تو کوئی سختی نہیں، ایسے افراد کے دل پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہوتے ہیں۔ لیکن کوئی بات نہیں۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ عوام جب خود پر کی گئی زیادتیوں کا حساب لینے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو وہ بہت کڑا حساب لیتے ہیں۔ تب ایسے ظالم حکمران بہت پچھتاتے ہیں جبکہ پچھتاوا کام نہیں آتا۔

اب آیئے خلیفۂ عادل حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی شبانہ گردی کا ایک اور واقعہ پڑھتے ہیں۔ کتاب ”عِقدُ الفرید“ کے مؤلف نے لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک رات گشت کرتے کرتے مدینہ کے باہر میدان میں جا نکلے۔ وہاں انھیں بالوں کا ایک خیمہ

نظر آیا جو پہلے کبھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ اس کے قریب گئے تو ایک عورت کے کراہنے کی آواز آئی۔ خیمے کے قریب ہی ایک آدمی بیٹھا تھا۔ اس کے پاس گئے۔ سلام کیا اور پوچھا کہ تم کون ہو۔ وہ بولا: ''خانہ بدوش ہوں۔ امیرالمومنین کی خدمت میں آیا تھا کہ ان کے بحرِ سخاوت میں سے کچھ فیض پاؤں۔''

فرمایا: ''یہ آواز کیسی ہے جو خیمے میں سے سنائی دیتی ہے؟''

وہ بولا: ''اللہ تم پر رحم کرے، جاؤ اپنا کام کرو۔''

فرمایا: ''پھر بھی، بتاؤ تو سہی، ہوا کیا ہے؟''

وہ بولا: ''میری بیوی ہے جسے دردِ زہ نے آلیا ہے۔''

پوچھا: ''کیا تمھارے ہمراہ کوئی اور ہے۔''

اس نے نفی میں جواب دیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فوراً چل پڑے۔ گھر آئے۔ اپنی اہلیہ حضرت ام کلثوم بنت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما سے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے تمھاری طرف کچھ اجر و ثواب بھیجا ہے، کیا اُسے حاصل کروگی؟''

وہ بولیں: ''کیسا اجر و ثواب؟''

فرمایا: ''ایک مسافر عورت ہے۔ بیچاری کو دردِ زہ نے آلیا ہے اور اس کے پاس کوئی نہیں۔''

وہ بولیں: ''بالکل! اگر آپ چاہیں تو۔''

فرمایا: ''تو ٹھیک ہے۔ ولادت کے لیے کپڑا تیل لے لو اور مجھے ایک ہانڈی، تھوڑی چربی اور کچھ اناج لادو۔''

وہ یہ تمام اشیا لے آئیں۔ آپ نے ہانڈی اٹھائی اور فرمایا: ''چلو۔'' وہ آپ کے پیچھے پیچھے چلتی گئیں۔ خیمے کے قریب پہنچے تو اہلیہ سے کہا: ''اس عورت کے پاس جاؤ۔'' خود بدو کے پاس جا بیٹھے۔ اس سے فرمایا: ''آگ جلاؤ۔'' اس نے آگ جلا دی۔ آپ نے ہانڈی آگ پر چڑھائی اور اس میں اناج ڈال کر پکانے لگے۔ اتنے میں خانہ بدوش کی بیوی نے بچہ جنا۔ خیمے میں سے حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کی آواز آئی:

''امیرالمومنین! اپنے ساتھی کو بیٹے کی خوشخبری دیجیے۔''

بدو نے ''امیرالمومنین'' کا لفظ سنا تو گھبرایا۔ ذرا مؤدب ہوا اور قدرے ہٹ کر بیٹھنے لگا۔ فرمایا: ''اپنی جگہ بیٹھے رہو۔''

کھانا پک کر تیار ہو چکا تھا۔ امیرالمومنین نے ہانڈی اٹھائی، اسے خیمے کے دروازے تک لے گئے اور اہلیہ سے کہا کہ زچہ کو کھانا کھلا دو۔ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا نے زچہ کو کھانا کھلا کر ہانڈی دروازے سے باہر دھکیل دی۔ امیرالمومنین نے ہانڈی اٹھائی اور بدو کے سامنے رکھ کر فرمایا:

''تم بھی کھالو۔ رات بھر جاگتے رہے ہو۔''

اہلیہ سے کہا کہ اب باہر آ جاؤ۔ گھر چلتے ہیں۔

بدو سے فرمایا: ''صبح ہمارے پاس آنا۔ ہم تمھاری ضروریات کا بندوبست کریں گے۔''[1]

امام ابن الجوزی نے ان کی شبانہ گردی کا ایک اور واقعہ درج کیا ہے کہ ایک رات وہ مدینہ منورہ میں گشت کر رہے تھے کہ ایک گھر کے قریب سے گزرے۔ گھر کا دروازہ

---

[1] المنتظم لابن الجوزي، ص: 73، والعقد الفريد، ص: 98.

بند تھا۔ اندر سے ایک عورت کی آواز آرہی تھی جو شوہر کے فراق میں بڑا دردانگیز گیت گنگنا رہی تھی۔ گیت گا کر اس نے ٹھنڈی آہ بھری اور بڑی حسرت سے کہا: ''عمر بن خطاب کو میری وحشت اور میرے شوہر کی عدم موجودگی کی کیا پروا!''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دروازے پر دستک دی۔ وہ بولی: ''یہ کون ہے جو اس وقت اکیلی عورت کے ہاں آیا ہے؟''

فرمایا: ''دروازہ کھولو۔''

اس نے دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا۔ آپ نے اصرار کیا تو اس نے کہا: واللہ! اگر امیر المومنین کو پتہ چل گیا تو وہ تمھیں سخت سزا دیں گے۔

فرمایا: ''دروازہ کھولو۔ میں امیر المومنین ہی ہوں۔''

عورت نے دروازہ کھول دیا۔ فرمایا: ''ذرا وہی گیت پھر گانا جو تم ابھی گا رہی تھیں۔''

اس نے وہ تمام شعر پھر گنگنا دیے۔

پوچھا: ''تمھارا خاوند کہاں ہے؟''

اس نے بتایا کہ وہ فلانے لشکر کے ہمراہ گیا ہے۔

آپ نے اس لشکر کے امیر کو پیغام بھیجا کہ فلانے آدمی کو واپس بھیج دیجیے۔ وہ آدمی آیا تو آپ نے فرمایا: ''اپنے گھر جاؤ۔'' پھر اپنی بیٹی حفصہ کے ہاں گئے اور دریافت کیا: ''بیٹی! عورت اپنے خاوند کے بغیر کتنا صبر کرسکتی ہے؟'' وہ بولیں: ''ایک ماہ، دو ماہ اور تین ماہ چوتھے مہینے پیمانۂ صبر لبریز ہو جاتا ہے۔''

چنانچہ انھوں نے ملک کے کونے کونے میں عمالِ حکومت اور سپہ سالاروں کو لکھ بھیجا کہ سپاہیوں اور حکومتی اہلکاروں کو ہر چوتھے مہینے گھر آنے کی اجازت دیا کیجیے۔ [1]

[1] المنتظم لابن الجوزي، ص:71، والمحاسن والأضداد، ص:189.

معاشرے کی فضا پاکیزہ رکھنے کے لیے انھوں نے کئی اقدامات کیے۔ انھی میں سے ایک اقدام یہ بھی تھا کہ دور دراز کے سرکاری ملازمین کو ہر تین ماہ بعد رخصت دینے کا قانون نافذ کیا۔ اس قانون کی اہمیت کا اندازہ کچھ وہی افراد کر سکتے ہیں جنھیں شادی کے بعد کاروبار یا ملازمت کے سلسلے میں دور دراز کے ممالک جانا پڑتا ہے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ ایسے افراد کئی کئی برس تک گھروں کو نہیں لوٹتے۔ اسلام میں ایسے کسی کاروبار اور ایسی کسی ملازمت کی گنجائش نہیں جس کے نتیجے میں فرد اور معاشرے کو روحانی پاکیزگی سے ہاتھ دھونے پڑیں۔ اس لحاظ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نافذ کردہ قانون بڑا ہی لاجواب قانون تھا۔

یہ بیدار مغز حکمران رعایا کی کسی ضرورت سے بے خبر نہیں تھا۔ اور جو کام وہ خود کر سکتا تھا اسے کسی اور کے سپرد نہیں کرتا تھا۔ ایک مرتبہ شدید گرمی کے موسم میں عراق کا ایک وفد حاضرِ خدمت ہوا۔ وفد میں حضرت احنف بن قیس رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ شلوکا سر پر لپیٹے زکاۃ کے ایک اونٹ کے بدن پر دوا مل رہے تھے۔ آپ کی نظر جونہی حضرت احنف بن قیس رضی اللہ عنہ پر پڑی، انھیں مخاطب کیا اور کہا: ''احنف! کپڑے اتارو اور آکر امیر المومنین کی مدد کرو۔ یہ زکاۃ کا اونٹ ہے۔ یہ یتیموں، بیواؤں اور مسکینوں کا حق ہے۔''

ایک صاحب نے جو وہیں موجود تھے، عرض کیا: ''یا امیر المومنین! کسی غلام سے کہہ دیجیے۔ وہ یہ کام کر دے گا۔''

فرمایا: ''مجھ سے اور احنف سے بڑا غلام اور کون ہے!''

پھر آپ نے وہ لازوال جملہ کہا جو اِس لائق ہے کہ ہر حکمران کا دستور العمل بنے۔

آپ نے فرمایا: ''جس طرح غلام کا یہ فرض ہے کہ وہ آقا کی بھلائی چاہے اور اس کی امانت ادا کرے اسی طرح حکمران کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ رعایا کی بھلائی چاہے اور ان کی امانت ادا کرے۔'' [1]

خلیفۂ ثانی اور ان کی رعایا

معن بن زائدہ نامی ایک آدمی نے کسی طرح سرکاری مہر کا نقش حاصل کیا اور جعلی مہر بنا کر کوفے کے بیت المال میں سے بہت سا مال نکلوانے میں کامیاب ہوگیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پتہ چلا تو آپ نے کوفے کے والی حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ مجھے خبر ملی ہے کہ معن بن زائدہ نامی ایک شخص نے جعلی مہر بنا کر کوفے کے بیت المال میں سے بہت سا مال نکلوایا ہے۔ آپ کو جونہی میرا مکتوب ملے، میرا اَمر نافذ کریے اور میرے نمائندے کی بات مانیے۔

حضرت خلیفہ کا نمائندہ خط لیے کوفہ پہنچا۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے عصر کی نماز پڑھائی۔ لوگ ابھی بیٹھے تھے کہ آپ نمائندے کو ساتھ لیے اٹھے اور معن بن زائدہ کے سر پر جا کھڑے ہوئے۔ نمائندے سے فرمایا کہ امیر المومنین نے مجھے آپ کے حکم کی تعمیل کرنے کو کہا ہے، اس لیے آپ کو جو فرمانا ہے، فرمائیے۔ جناب خلیفہ کے نمائندے نے کہا ایک پھندا لائیے۔ پھندا لایا گیا تو اس نے معن بن زائدہ کی گردن میں پھندا ڈال کر زور سے کھینچا اور مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے کہا اسے قید خانے میں ڈال دیجیے تا آنکہ اِس کے متعلق آپ کو امیر المومنین کا اگلا فرمان موصول ہو۔

اس زمانے میں قید خانے بانس کے بنائے جاتے تھے۔ معن بن زائدہ نے قید خانے

[1] المنتظم لابن الجوزي، ص: 62.

سے فرار ہونے کا بندوبست کرلیا اور اہل خانہ کو کہلا بھیجا کہ میری سواری، باندی اور شلوکا بھیج دو۔ اس نے باندی کو اپنے پیچھے سوار کیا اور نکل بھاگا۔ رات بھر چلتا رہا۔ پو پھوٹنے پر اونٹنی بٹھائی اور نیچے اتر کر چھپ گیا۔ دن بھر چھپا رہا۔ تلاش کا سلسلہ جو رات سے جاری تھا تھم گیا تو وہ کمین گاہ سے نکلا، اونٹنی پر بیٹھا، باندی کو بھی سوار کیا اور چل پڑا۔ مدینے پہنچا۔ حضرت خلیفہ ہاتھ میں دُرہ لیے لوگوں کو نماز فجر کے لیے بیدار کررہے تھے۔ معن بن زائدہ نے اونٹنی بٹھائی۔ باندی کو وہیں چھوڑا اور حاضر خدمت ہوکر سلامِ خلافت پیش کیا۔ جناب خلیفہ نے سلام کا جواب دیا اور دریافت کیا کہ کون ہے۔ وہ بولا: ''معن بن زائدہ ہوں۔ توبہ کرنے کے لیے حاضر خدمت ہوا ہوں۔''

حضرت خلیفہ نے صبح کی نماز پڑھائی اور لوگوں سے کہا کہ ذرا مسجد ہی میں تشریف رکھیے۔ طلوعِ آفتاب کے بعد لوگوں کو مخاطب کیا اور فرمایا: ''یہ معن بن زائدہ ہے۔ اس نے جعلی مہر بنا کر کوفے کے بیت المال میں سے کچھ مال نکلوالیا تھا۔ بتائیے، اس سے کیا سلوک کرنا چاہیے۔'' ایک صاحب نے کہا: اس کا ہاتھ کاٹ ڈالیے۔ ایک نے کہا: اسے سولی پر لٹکا دیجیے۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ خاموش بیٹھے تھے۔ آپ نے اُن کو مخاطب کیا: ''ابوحسن! آپ کیا کہتے ہیں؟''

انھوں نے عرض کیا: ''یا امیرالمومنین! اس آدمی نے ایک جھوٹ ہی تو بولا تھا۔''

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے بطورِ سزا خوب کوڑے لگائے اور قید خانے میں ڈال دیا۔ جب تک اللہ نے چاہا وہ قید خانے میں رہا۔ ایک روز اس نے اپنے ایک قریشی دوست کو پیغام بھیجا کہ امیرالمومنین سے میری سفارش کردو، وہ مجھے رہا کردیں۔ اس نے آپ سے بات کی اور عرض کیا کہ یا امیرالمومنین! معن بن زائدہ جتنی سزا کا مستحق

تھا وہ اسے مل گئی۔ اب اگر آپ مناسب سمجھیں تو اسے رہا کر دیجیے۔‘‘

حضرت خلیفہ نے فرمایا: ’’میں تو اس معاملے کو بھول چکا تھا، تم نے یاد دلا دیا۔‘‘ غلام سے کہا کہ معن بن زائدہ کو لے آؤ۔ وہ لے آیا تو آپ نے اُسے خوب کوڑے لگائے اور دوبارہ قید خانے میں ڈلوا دیا۔ اب کے اس نے اپنے تمام دوستوں کو کہلا بھیجا کہ خدا کے واسطے آئندہ امیر المومنین سے میرا ذکر مت کرنا، چنانچہ جب تک اللہ نے چاہا، وہ قید خانے میں رہا۔ ایک روز حضرت خلیفہ کو یاد آیا تو آپ نے حکم دیا کہ معن کو حاضر کرو۔ اسے لایا گیا تو آپ نے اس سے تمام مال نکلوایا اور رہا کر دیا۔[1]

اسی قبیل کا ایک اور واقعہ ملاحظہ کیجیے۔ جبلہ بن ایہم غسانی آلِ جفنہ کا بادشاہ تھا۔ وہ اسلام لایا تو اس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہوں۔ آپ نے اسے آنے کی اجازت دی تو وہ قبیلہ عک وغسان کے پانچ سو افراد کے ہمراہ روانہ ہوا جو تمام کے تمام اس کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا قافلہ مدینہ منورہ سے دو مراحل کے فاصلے پر آپہنچا تو جبلہ بن ایہم نے آپ کو خط لکھ کر اپنی آمد کی خبر دی۔ آپ بے حد مسرور ہوئے اور لوگوں کو حکم دیا کہ آگے بڑھ کر جبلہ بن ایہم اور اس کے اہل خانہ کا استقبال کریں۔ ادھر جبلہ بن ایہم نے اپنے سو افراد کو تیاری کا حکم دیا تو انھوں نے نہایت بیش قیمت ریشمی لباس پہنا، اسلحہ باندھا اور گھوڑوں کو سونے چاندی کے زیورات سے آراستہ کیا۔ خود جبلہ بن ایہم نے شاہی تاج پہنچا جس میں اس کی دادی ماریہ کی دو بالیاں بھی آویزاں تھیں۔ یوں یہ تمام افراد نہایت بن سنور کر مدینہ منورہ میں داخل ہوئے۔ مدینہ منورہ کے تمام لوگ کیا بڑے، کیا چھوٹے، ان کی آمد کا نظارہ کرنے گھروں سے نکل آئے۔

[1] فتوح البلدان: 4/8، والإصابة: 3/528.

حضرت خلیفہ کی خدمت میں پہنچے تو آپ نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا، نہایت خندہ پیشانی سے پیش آئے اور جبلہ بن ایہم کو اپنے قریب بٹھایا۔ بعدازاں آپ نے حج کا ارادہ کیا تو جبلہ بھی ہمراہ ہولیا۔ طوافِ کعبہ کے دوران میں بنی فزارہ کے ایک شخص کا پاؤں جبلہ کے تہ بند پر آ گیا۔ تہ بند کھل گیا۔ جبلہ نے طیش میں آ کر اس بیچارے کے اِس زور کا تماچا مارا کہ ناک کی ہڈی توڑ ڈالی۔ فزاری نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے آگے فریاد کی۔ آپ نے جبلہ کو بلا بھیجا۔ وہ آیا تو آپ نے پوچھا کہ یہ کیا غضب کیا۔ وہ بولا: یاامیرالمومنین! اس نے جان بوجھ کر میرا تہ بند اتارا۔ کعبہ کی حرمت کا پاس نہ ہوتا تو میں تلوار کے وار سے اس کا سر کھول دیتا۔

آپ نے فرمایا: ''تم نے خود اقبالِ جرم کر لیا۔ اب اِس آدمی کو راضی کرو ورنہ میں اسے تم سے قصاص دلواؤں گا۔''

''آپ مجھ سے کیا قصاص لیں گے؟'' جبلہ نے پوچھا۔

فرمایا: ''تمھاری ناک بھی توڑ ڈالی جائے گی۔''[1]

وہ بولا: ''یہ کیسے ہوسکتا ہے جبکہ وہ معمولی سا آدمی ہے اور میں بادشاہ ہوں۔''

آپ نے فرمایا: ''اسلام نے تم دونوں کو برابر کر دیا ہے۔ تم تقویٰ اور عافیت کے لحاظ سے ہی اس پر فوقیت پا سکتے ہو۔''

جبلہ نے کہا: ''یاامیرالمومنین! میں نے تو سمجھا تھا کہ اسلام میں مجھے جاہلیت سے بڑھ کر عزت ملے گی۔''

فرمایا: ''چھوڑو ان باتوں کو۔ اس آدمی کو جیسے بھی ہو، راضی کرو ورنہ میں اسے تم سے قصاص دلواؤں گا۔''

---

[1] فتوح البلدان، ص: 142.

وہ بولا: ''تب تو میں عیسائی ہو جاؤں گا۔''

فرمایا: ''عیسائی ہوئے تو میں تمھاری گردن مار ڈالوں گا کیونکہ اب تم اسلام لا چکے ہو۔ مرتد ہوئے تو تمھیں قتل کر ڈالوں گا۔''

جبلہ کو جب یقین ہو گیا کہ امیر المومنین قصاص لیے بغیر نہ چھوڑیں گے اور اسلام سے روگردانی موت کو گلے لگانے کے مترادف ہے تو اس نے کہا: ''میں آج رات اس کے متعلق سوچوں گا۔'' شام ہوئی تو امیر المومنین نے اس سے فرمایا: ''ٹھیک ہے۔ اپنی قیام گاہ پر جاؤ اور خوب سوچ سمجھ لو۔'' جب رات آئی اور لوگ سو گئے تو جبلہ بن ایہم نے ہمراہیوں کو فوری تیاری کا حکم دیا اور گھوڑے پر سوار ہو کر شام کی طرف نکل بھاگا۔ صبح ہوئی تو مکہ میں ان لوگوں کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔[1]

لوگوں کی اونچ نیچ کا صرف ایک معیار ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں نازل فرمایا ہے:

﴿ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ﴾

''اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ قابل تکریم وہ ہے جو تم میں زیادہ متقی ہے۔''[2]

یہی ہے وہ واحد کسوٹی جس پر لوگوں کو پرکھا جائے گا کہ ان میں کون بڑا ہے اور کون چھوٹا۔ یہ خالص آسمانی معیار ہے۔ زمینی اقتدار سے اس کا قطعی کوئی تعلق نہیں۔ لوگوں نے حسب و نسب، قوت و طاقت اور روپے پیسے کے لحاظ سے اونچ نیچ کے جو معیار قائم کر رکھے ہیں، ان کی ہرگز کوئی حیثیت نہیں۔ ان معیاروں کی اگر کوئی حیثیت ہوتی تو وہ نیک نہاد افراد عزت کی نگاہ سے نہ دیکھے جاتے جنھوں نے دنیا میں دولت

[1] أخبار عمر لعلي الطنطاوي، ص: 208. [2] الحجرٰت 13:49.

نہیں کمائی، نہ ان کے پاس قوت و طاقت تھی نہ وہ اونچے حسب ونسب والے تھے۔ ان کی حیات مستعار کا حاصل علم وعمل کے وہ چراغ تھے جنھیں وہ خونِ جگر سے اکساتے اور جہالت کے اندھیرے کو شعور وادراک کے اجالے میں بدلتے رہے۔

آیئے امیرالمومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی شبانہ گردی کا ایک اور واقعہ پڑھتے ہیں۔ ایک رات وہ کسی گلی سے گزر رہے تھے کہ ایک عورت کی گنگناتی آواز ان کے کانوں میں پڑی۔ وہ نصر بن حجاج نامی ایک نوجوان کی محبت میں سرشار گیت گا رہی تھی۔ پاس بیٹھی سہیلی نے جب نصر بن حجاج کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ نصر بن حجاج وہ ہے جس کے ساتھ میں طویل رات کے حسین لمحے گزارنا چاہتی ہوں۔

نصر بن حجاج خوش شکل نوجوان تھا۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اس عورت کی یہ بات سن کر فرمایا: جب تک عمر زندہ ہے، ایسا نہیں ہوسکتا۔ اگلی صبح نصر بن حجاج کو بلا بھیجا۔ وہ آیا تو آپ نے دیکھا کہ اس کے بال گھنے سیاہ اور چہرہ نہایت صبیح ہے۔ آپ نے اسے حکم دیا کہ سر منڈا دو۔ اس نے حسبِ ارشاد سر منڈا دیا۔ گوری چندیا نکل آئی۔ وہ اور بھی خوبصورت لگا۔ آپ نے اس سے فرمایا کہ عمامہ باندھا کرو۔ اُس نے تعمیل ارشاد میں عمامہ باندھا تو اس کی سندرتا میں مزید اضافہ ہوگیا۔ آپ نے اس سے فرمایا: ''تم میرے ساتھ اس شہر میں نہیں رہ سکتے جس کی عورتیں تمھاری تمنا کرتی ہیں۔'' آپ نے اسے زادِ راہ دیا، ضرورت کا سامان مہیا کیا اور بصرہ بھیج دیا۔ ادھر اس عورت کو پتہ چلا کہ امیرالمومنین نے اس کی باتیں سن لی ہیں تو اس نے آپ کو خط لکھا اور رضامندی کی طالب ہوئی۔ آپ نے اس کے متعلق پوچھ تاچھ کی تو معلوم ہوا کہ وہ پاکدامن عورت ہے، چنانچہ اسے کہلا بھیجا کہ مجھے تمھارے متعلق اچھی خبر ملی ہے، اس

لیے اطمینان رکھو۔ میں نے نصر بن حجاج کو تمھاری وجہ سے نہیں نکالا بلکہ مجھے پتہ چلا تھا کہ وہ عورتوں کے ہاں جاتا ہے۔ یوں ان عورتوں کے متعلق میں بے فکر نہیں رہ سکتا تھا۔ آپ اس کا خط پڑھ کر رو پڑے اور فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے خواہش نفس کو قید کیا تو اسے قرار آ گیا۔''

بصرہ روانگی سے قبل نصر بن حجاج نے آپ کی خدمت میں سفارش بھی پیش کی کہ مجھے مدینہ منورہ سے مت نکالیے۔ آپ نے اس کی سفارش قبول نہ کی تو اس نے کہا: ''آپ نے تو مجھے مار ہی ڈالا۔''

فرمایا: ''وہ کیسے؟''

وہ بولا: ''اللہ تعالیٰ نے مقتولی اور جلاوطنی کا ایک ساتھ ذکر کیا ہے۔ فرمایا:

﴿ وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيٰرِكُمْ ﴾

''اور اگر ہم ان پر فرض کر دیتے کہ اپنے آپ کو قتل کرو یا اپنے گھروں سے نکلو۔''[1]

فرمایا: ''تمھاری دلیل قابلِ التفات ہے تاہم میں وہی بات کہتا ہوں جو شعیب علیہ السلام نے کہی تھی:

﴿ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلٰحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۚ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ﴾

''میں تو حسبِ استطاعت صرف اصلاح کرنا چاہتا ہوں۔ اور میری توفیق اللہ ہی کے ساتھ ہے۔''[2]

تمھارا وظیفہ دو چند کر دیا گیا ہے تاکہ وہ تمھاری جلاوطنی کا عوض بن سکے، چنانچہ نصر بن حجاج مدینہ منورہ سے روانہ ہو کر بصرہ جا پہنچا۔[3]

[1] النسآء 66:4. [2] هود 88:11. [3] المنتظم لابن الجوزي، ص: 74، والإصابة: 975/3.

اسلامی معاشرے کی پاکیزہ فضا کا تحفظ کرنا اور اسے فحاشی و عریانی کے بد اثرات سے بچانا بہت ضروری ہے۔ معاشرے میں فحاشی و عریانی پھیلنے کا سیدھا سادہ مطلب یہ ہے کہ وہ معاشرہ جلد ہی زوال کی پستیوں میں جا گرے گا۔ قوم کی ترقی کا اندازہ افراد کے عمل و کردار سے کیا جاتا ہے۔ قوم کے افراد قوانین کا جتنا احترام کریں گے قوم اسی قدر ترقی کی منازل طے کرے گی۔ اسلامی معاشرے کی جو حالت زار آج ہمارے سامنے ہے، معاشرے کے تمام باشعور افراد کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔ یہ معاشرہ اسلامی روایات واقدار سے ہاتھ دھو کر جس تیزی سے غیروں کی روایات واقدار اپنا رہا ہے وہ بے حد حیران کن اور غایت درجہ خطرناک ہے۔ حکمرانوں کو اس طوفانِ بدتمیزی کے آگے بند باندھنا چاہیے تھا لیکن بدقسمتی سے وہ خود بے حیائی کے اس سیلاب کو بڑھاوا دینے میں مصروف ہیں۔ یوں معاشرے کا نوجوان طبقہ بے راہ روی کا شکار ہو رہا اور قومی ترقی میں ہاتھ بٹانے کے بجائے اس کی راہ میں رکاوٹ بن رہا ہے۔

آخری ایام

حضرت سعید بن مسیّب رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ عمر (رضی اللہ عنہ) نے حج کے دوران میں منیٰ سے روانہ ہوئے تو کچھ دیر وادیٔ ابطح میں ٹھہرے۔ کنکروں کی ڈھیری سی بنائی اور اس پر کپڑا ڈال کر لیٹ گئے۔ ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے اور گویا ہوئے: ''بارِ الٰہا! میں بوڑھا ہو گیا ہوں، میری قوت جواب دے گئی اور میری رعایا بہت پھیل گئی ہے۔ اب تو مجھے اس حال میں اپنے ہاں بلا لے کہ نہ تو میں نے اپنے فرائض کی ادائیگی میں کچھ کوتاہی کی ہو اور نہ کسی سے کوئی زیادتی۔''

حج کر کے مدینہ تشریف لائے تو لوگوں سے خطاب کیا:

''لوگو! آپ کے لیے تمام فرائض مقرر کر دیے گئے، دین کے تمام طریقے آپ کو بتلا دیے گئے اور آپ کو نہایت صاف راستے پر ڈال دیا گیا۔''

پھر دایاں ہاتھ بائیں پر مارا اور فرمایا: ''سوائے اس امر کے کہ لوگ آپ کو سیدھے راستے سے اِدھر اُدھر بھٹکا دیں۔''

حضرت ابوطلحہ یعمری رحمہ اللہ کی روایت کے مطابق حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے جمعہ کے روز لوگوں سے خطاب کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ذکر خیر کرنے کے بعد فرمایا: ''میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ایک مرغے نے میرے دو ٹھونگیں ماری ہیں۔ اس خواب کی تعبیر میں تو یہی سمجھا ہوں کہ میری اجل آن پہنچی ہے۔ کچھ افراد مجھے حکم دے رہے ہیں کہ میں خلیفہ نامزد کر جاؤں حالانکہ اللہ تعالیٰ اپنا دین اور اپنی خلافت ضائع نہیں کرنے کا۔ قسم اُس ذات کی جس نے اپنے نبی کو اس دین کے ہمراہ مبعوث کیا، اگر بڑے امر (موت) نے مجھے جلدی میں ڈال دیا تو خلافت ان چھ افراد کی مشاورت سے طے پائے گی جن سے اللہ کے نبی تا حیات راضی رہے۔''

مزید یہ دعا فرمائی: ''خدایا! میں تجھے امرائے خلافت کا گواہ بناتا ہوں۔ میں نے انھیں صرف اس لیے بھیجا تھا کہ وہ لوگوں کو ان کا دین سکھلائیں، ان کے نبی کی سنت کے متعلق بتلائیں، ان کے درمیان عدل و انصاف قائم کریں، ان کا مال ان میں تقسیم کریں اور لوگوں کا جو معاملہ انھیں پیچیدہ نظر آئے اسے میرے سامنے لائیں۔''

پھر فرمایا: ''لوگو! آپ دو پودے کھاتے ہیں جنھیں میں تو خبیث ہی سمجھتا ہوں۔ میری مراد پیاز اور لہسن سے ہے۔ خود میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ مسجد میں کسی آدمی سے ان کی بو پاتے تو اسے حسبِ ارشاد مسجد سے نکال کر بقیع کی طرف

بھیج دیا جاتا۔ سو آپ میں سے جو کوئی یہ دونوں پودے کھائے وہ انھیں بھون پکا کر اُن کی بو مار لیا کرے۔"[1]

امام طبری رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ جو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی طرف سے کوفہ کے والی تھے، انھوں نے آپ کو لکھا کہ میرا ایک غلام ہے، ابولؤلؤ فیروز، بڑا ہنرمند غلام ہے۔ وہ لوہار ہے۔ بڑھئی بھی ہے اور نقش و نگار بنانا بھی جانتا ہے۔ آپ اسے مدینہ منورہ آنے کی اجازت دیجیے تاکہ لوگ اس کی ہنرمندی سے فائدہ اٹھائیں۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اجازت مرحمت فرمائی۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ نے ابولؤلؤ کو دارالخلافہ بھیج دیا اور اس سے یہ طے کیا کہ مجھے ہر ماہ سو درہم دے دیا کرنا۔ ابولؤلؤ چکیاں بنایا کرتا تھا۔ ایک روز اس نے امیرالمومنین سے شکایت کی کہ میرے آقا مغیرہ نے ہر مہینے جتنے روپیہ کی ادائیگی میرے ذمہ لگائی ہے وہ بہت زیادہ ہے۔ ان سے بات کریے کہ وہ روپیہ تھوڑا کم کریں۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ تم کیا کیا کام جانتے ہو۔ اس نے کاموں کی تفصیل بتائی تو آپ نے فرمایا: تم جتنے ہنرمند ہو، اس لحاظ سے یہ رقم کچھ زیادہ نہیں۔ آپ کا ارادہ تھا کہ مغیرہ بن شعبہ سے ملوں گا اور اس غلام کے متعلق اس سے بات کروں گا کہ اس بیچارے کا بوجھ تھوڑا ہلکا کر دے۔ ابولؤلؤ کو ان کی بات پر غصہ آیا۔ اس نے آپ کو قتل کرنے کی ٹھان لی۔ اس نے دو دھاری خنجر بنایا۔ اسے زہر میں بجھایا اور ہرمزان کے ہاں آیا۔ اسے خنجر دکھا کر پوچھا کہ یہ خنجر کیسا ہے۔ ہرمزان نے کہا کہ بھئی بڑا زبردست خنجر ہے۔ اس کا وار جس پر بھی پڑا وہ بچ نہیں پائے گا۔

[1] الرياض النضرة: 74/2، والمنتظم لابن الجوزي، ص: 584.

ایک روز حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ابولؤلؤ کی دکان پر گئے اور اس سے فرمایا کہ سنا ہے تم پَوَن چکی بنا سکتے ہو۔ اس نے پلٹ کر بڑے غصے سے آپ کی طرف دیکھا۔ چند اور افراد بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ اس نے گستاخانہ کہا: ''تمھارے لیے تو میں ایسی چکی بناؤں گا کہ لوگ یاد کریں گے۔'' اس کی یہ بات آپ نے نہایت صبر وتحمل سے سنی اور ہمراہیوں سے کہا: ''اِس غلام نے مجھے قتل کی دھمکی دی ہے۔''[1]

شہادت

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا معمول تھا کہ جماعت کھڑی ہوتی تو صفوں میں آتے اور کہتے: ''برابر ہو جائیے۔'' سب لوگ برابر کھڑے ہو جاتے تو آپ آگے بڑھتے اور تکبیر کہتے۔ اس روز بھی آپ نے صفیں سیدھی کرائیں اور آگے بڑھے۔ چوتھی تکبیر کہی، ابولؤلؤ نے آپ کے خنجر مارا۔ آپ نے کہا کہ مجھے کتے نے مار ڈالا، یا یہ کہا کہ مجھے کتا کھا گیا۔ خنجر کا وار کر کے ابولؤلؤ واپس پلٹا اور دائیں بائیں خنجر لہراتا گیا۔ یوں اس نے مزید تیرہ آدمیوں کو شدید زخمی کیا جن میں سے سات آدمی بعد ازاں شہید ہو گئے۔ وہ درندہ شاید کچھ اور لوگوں کو کاٹتا کہ ایک صاحب نے آگے بڑھ کر اس پر چادر پھینکی اور اسے پکڑنا چاہا۔ ابولؤلؤ کو جب یقین ہو گیا کہ اب وہ پکڑا جائے گا تو اس ملعون نے خود پر خنجر کا وار کیا اور خودکشی کر لی۔[2]

ابولؤلؤ کا یہ بہیمانہ اقدام اس کی اپنی شرارت کا نتیجہ نہیں تھا۔ اِس اقدام کے پیچھے کئی اور لوگوں کا خفیہ ہاتھ تھا۔ انھی نے اس قتل کی منصوبہ بندی کی تھی۔ ابولؤلؤ تو ان کے اشاروں پر ناچنے والی کٹھ پتلی تھی۔ سوال یہ ہے کہ اُس نے خود کو کیوں مار ڈالا۔ ہر

[1] تاریخ الطبري:245/4، واسد الغابة:76/4. [2] الطبقات الكبرٰى لابن سعد:338/3، والكامل لابن الأثير:50/3.

انسان چاہتا ہے کہ وہ حیاتِ مستعار کے زیادہ سے زیادہ پل جیے۔ ابولؤلؤ جیسا قاتل بھی جسے یقین ہوتا ہے کہ وہ گرفتار ہو کر کیفرِ کردار کو پہنچے گا، زندہ رہنا چاہتا ہے۔ وہ امید کرتا ہے کہ اسے راہِ فرار مل جائے گی۔ وہ جیل سے بھاگنے کی کوشش کرے گا۔ زندگی کے زیادہ سے زیادہ لمحے پانے کے لیے کوئی اور وسیلہ اختیار کرے گا۔ کچھ بھی نہ ہو تو کم از کم اپنے ہاتھوں وہ موت کے گھاٹ نہیں اترتا۔ لیکن اگر وہ قتل کرنے کے بعد خود کو مار ڈالتا ہے تو ضرور ہے کہ اس نے کسی کے ایما پر ایسا کیا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ یہود نے بہت سے عیسائی زعما کو تہ تیغ کیا۔ ہزاروں کو قید خانوں میں ڈال کر اذیت ناک موت سے دوچار کیا۔ اِس کے باوجود انھیں اس وقت تک چین نہ آیا جب تک عیسائیت نے توحید کا کرتا اتار کر عقیدۂ تثلیث کا مشرکانہ لبادہ نہیں اوڑھ لیا۔ اسلام کے متعلق بھی ان کی یہی منصوبہ بندی تھی۔ ان کے گھناؤنے مقاصد کی تکمیل کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ تھے۔ وہ اِس رکاوٹ کو ہر قیمت پر ہٹا دینا چاہتے تھے، چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو فوراً گھر لایا گیا۔ نبیذ طلب کی اور نوش فرمائی تو وہ پیٹ کے زخموں میں سے نکل گئی، پھر دودھ منگایا اور پیا تو وہ بھی زخموں کے راستے سے نکل گیا۔ موت کے آثار واضح نظر آئے تو بیٹے عبداللہ سے فرمایا: ''ذرا آنکنا کہ مجھ پر کتنا قرض ہے۔'' انھوں نے حساب کیا تو قرض کی رقم چھیاسی ہزار درہم ہوئی۔ فرمایا: ''عبداللہ! آلِ عمر کا روپیہ ادائے قرض کے لیے ناکافی پڑے تو بنو عدی سے روپیہ طلب کرنا۔ بنو عدی کا روپیہ ادائے قرض کے لیے ناکافی پڑے تو قریش سے پوچھنا۔ ان کے علاوہ اور کسی سے سوال مت کرنا۔''

پھر فرمایا: ''عبداللہ! ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں جاؤ۔ ان سے کہنا کہ عمر

آپ کو سلام عرض کرتا ہے۔ ''امیر المومنین رضی اللہ عنہ مت کہنا کہ آج میں امیر نہیں رہا، پھر کہنا کیا آپ عمر کو اپنے دونوں صاحبوں کے پہلو میں دفن ہونے کی اجازت دیتی ہیں؟''

عبداللہ، ام المومنین کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوئے۔ وہ بیٹھی رو رہی تھیں۔ عبداللہ نے سلام عرض کیا اور کہا: ''عمر بن خطاب آپ سے اپنے دونوں صاحبوں کے پہلو میں دفن ہونے کی اجازت چاہتے ہیں۔'' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''وہ جگہ تو واللہ میں نے اپنے لیے سنبھال رکھی تھی لیکن آج میں انھیں خود پر ترجیح دوں گی۔''

عبداللہ، حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں واپس آئے تو کسی نے بتایا کہ عبداللہ آ گیا ہے۔ فرمایا: ''مجھے اٹھاؤ۔'' ایک صاحب نے اٹھا کر سہارا دیا تو عبداللہ سے فرمایا: ''کیا خبر لائے ہو؟'' عبداللہ نے بتایا کہ ام المومنین رضی اللہ عنہا نے آپ کو اجازت دے دی ہے۔'' فرمایا: ''مجھے اُس قطعۂ زمین سے بڑھ کر اور کسی شے کی فکر نہیں تھی۔'' عبداللہ سے فرمایا کہ جب میں مر جاؤں تو میرا جنازہ اٹھائے ام المومنین رضی اللہ عنہا کے دروازے پر ٹھہرنا اور پھر پوچھنا کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اجازت چاہتا ہے۔ اگر وہ اجازت مرحمت فرمائیں تو مجھے اندر لے جانا۔ اگر اجازت نہ دیں تو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کر دینا۔''[1]

چنانچہ ان کی امید بر آئی اور وفات کے بعد انھوں نے اپنے دونوں صاحبوں کی ہمسائیگی میں جگہ پائی۔

اسلام کے دوسرے خلیفۂ راشد امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے بدھ کے روز 26 یا 27 ذی الحج 23 ھ کو وفات پائی۔ ان کی عمر 63 برس کی تھی۔ مدتِ خلافت تھی 10 برس، 6 مہینے اور چند روز۔[2]

---

[1] الطبقات الکبریٰ لابن سعد: 338/3. [2] تهذيب التهذيب: 387/7، سير السلف لأبي القاسم الأصفهاني: 160/1.

ابتدا میں درج آیات کا شان نزول

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ان آیات

﴿ قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ ﴾

''(اے نبی!) آپ ایمان والوں سے کہہ دیجیے: کہ وہ ان لوگوں سے عفوو درگزر کریں جو اللہ کے ایام (گرفت کے دنوں) کی امید نہیں رکھتے، تاکہ اللہ کچھ لوگوں کو ان (اعمال) کی سزا دے جو وہ کماتے رہے۔''[11]

کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ آیات بالخصوص حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے متعلق نازل ہوئیں۔ تاہم

﴿ لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ ﴾

سے مراد رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ مسلمانوں نے غزوۂ بنی مصطلق میں مُریسیع نامی کنویں پر پڑاؤ کیا۔ عبداللہ بن ابی نے اپنے غلام کو کنویں سے پانی لانے بھیجا۔ وہ خاصی دیر میں پانی لے کر آیا۔ ابن ابی نے پوچھا کہ کیا بات ہوئی۔ اتنی دیر کیوں کی۔ وہ بولا عمر کا غلام کنویں کے منہ پر بیٹھا تھا۔ اس نے سب سے پہلے نبی کے مشکیزے بھرے، پھر ابوبکر کے مشکیزوں کو پانی سے لبالب کیا، بعد ازاں اپنے آقا کے مشکیزے بھرے۔ تب اس نے کسی اور کو پانی بھرنے دیا۔ ابن ابی کو بہت غصہ آیا۔ پیچ و تاب کھا کر بولا ہماری اور ان لوگوں کی مثال ایسی ہے جیسے کسی نے کہا تھا کہ اپنے کتے کو کھلا پلا کے

[11] الجاثیة 45:14.

موٹا کرو کہ وہ تمھی کو کاٹ کھائے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو اس کی یہ بات پتہ چلی تو آپ تلوار سونت کر اس کی طرف بڑھے۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔

میمون بن مہران رحمہ اللہ کی روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب یہ آیت:

﴿ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ﴾

''کون ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے؟''[1]

نازل ہوئی تو مدینہ کے رہنے والے فنحاص نامی یہودی نے ہرزہ سرائی کی کہ محمد کا رب محتاج ہو گیا۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے جب یہ بات سنی تو تلوار اٹھائی اور اس یہودی کو ڈھونڈنے نکل کھڑے ہوئے۔ اتنے میں حضرت جبریل علیہ السلام، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ آپ کا رب کہتا ہے:

﴿ قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ○ ﴾

اور یہ خبر بھی سنیے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ تلوار اٹھائے اس یہودی کی تلاش میں نکلے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صاحب کو دوڑایا کہ عمر بن خطاب جہاں ملیں، انھیں لے آئیں۔ وہ تشریف لائے تو آپ نے فرمایا: ''عمر! تلوار رکھ دیجیے۔'' حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''یارسول اللہ! آپ نے سچ فرمایا۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہے۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آپ کا رب کہتا ہے:

﴿ قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ○ ﴾

[1] البقرة2:245.

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''قسم اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا، میرے چہرے پر غصے کے آثار نظر نہیں آئیں گے۔''

اختتامیہ

امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے طرز حکومت کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ جہاں حکام کی طرف سے رعایا کی کڑی نگرانی کی جاتی وہیں رعایا بھی حکام کی حرکات و سکنات پر گہری نظر رکھتی تھی۔ رعایا کے ہر فرد کو یہ شعور حاصل تھا کہ اسلامی ریاست کے نظام میں پیدا ہونے والی بے اعتدالی کا ذمے دار حاکم وقت ہی نہیں، خود وہ بھی اسلامی ریاست کا فعال شہری ہونے کے ناتے اس بے اعتدالی کے لیے برابر کا ذمے دار ہے۔ اسی امر کے پیش نظر وہ نہ صرف اپنے عمل و کردار کی کڑی نگرانی کرتا بلکہ ارد گرد بسنے والے دیگر افراد کے طور اطوار کا بھی پورا پورا دھیان رکھتا تھا۔ وہ نفاذ شریعت کا تسلسل برقرار رکھنے میں مدد دیتا اور احکامات الٰہی کی تعمیل کے سلسلے میں حاکم وقت کا ممد و معاون ثابت ہوتا تھا۔ اس ضمن میں اس کا رویہ فرمان نبوی کے عین مطابق تھا کہ تم میں سے ہر ایک آدمی صاحبِ رعایا ہے اور تم میں سے ہر ایک آدمی اپنی رعایا کے متعلق جوابدہ ہے۔

ایک مرتبہ اہل یمن کی طرف سے مدینہ منورہ میں کچھ کپڑے آئے۔ امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے وہ کپڑے تمام مسلمانوں میں برابری کے ساتھ تقسیم کر دیے۔ ہر مسلمان کو ایک کپڑا میسر آیا۔ چند روز بعد حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے

لوگوں سے خطاب کیا۔ انھوں نے نیا کرتا پہن رکھا تھا۔ فرمایا: لوگو! میری بات سنو اور اطاعت کرو۔'' اس پر ایک صاحب اٹھے اور کہا: ''نہ آپ کی بات سنی جائے گی اور نہ اطاعت کی جائے گی۔''

''لیکن عرب کے بھائی! وہ کیوں؟'' امیر المومنین نے قدرے حیران ہو کر پوچھا۔

کیونکہ آپ نے خود کو ہم پر ترجیح دی ہے۔'' ان صاحب نے جواب دیا۔

''کس بات میں؟'' امیر المومنین نے مزید حیران ہو کر دریافت کیا۔

وہ صاحب بولے: ''یمن سے جو کپڑے آئے تھے، ان میں سے تمام مسلمانوں کو ایک ایک کپڑا ملا۔ آپ کو بھی ایک ہی کپڑا ملا۔ آپ سرو قد آدمی ہیں۔ آپ نے اس کپڑے سے اتنی لمبی قمیص کیونکر بنا لی؟''

امیر المومنین نے اپنے فرزند عبداللہ کو مخاطب کیا اور کہا کہ عبداللہ! ان صاحب کو جواب دو۔ عبداللہ اٹھے اور بتایا کہ امیر المومنین نے اپنا کپڑا کاٹ کر قمیص بنانی چاہی تو کپڑا قمیص کے لیے ناکافی تھا۔ تب میں نے اپنا کپڑا امیر المومنین کی خدمت میں پیش کیا۔ یوں آپ کی قمیص تیار ہوئی۔

وہ صاحب تسلی بخش جواب پا کر بولے: ''اب آپ کو جو فرمانا ہے، فرمائیے۔ آپ کی بات پوری توجہ کے ساتھ سنی اور مانی جائے گی۔''[1]

یوں ان کے دور حکومت میں ہر آدمی نہایت چوکنا رہتا تھا۔ اُسے جو بات مشکوک نظر آتی، اس کو فوراً اسلام کی کسوٹی پر رکھ کر پرکھتا، کچھ خلل دکھائی دیتا تو فی الفور تحقیق کرتا اور اطمینان کیے بغیر نہ رہتا۔ ہوشیار پہرے دار کی طرح وہ ہر بات کا گہری نظر

[1] الطبقات الکبرٰی لابن سعد: 3/273.

سے جائزہ لیتا اور چوراچکوں کو یہ احساس دلاتا رہتا کہ اس کی آنکھ غافل نہیں اور اس کا ہاتھ اسلحے پر ہے۔ تم میں سے جو کوئی اس کی چراگاہ کے آس پاس پھٹکا، وہ تلوار کا بھرپور وار کرکے اس کی گردن اتارنے سے دریغ نہیں کرے گا۔ احتساب کا یہ عمل مردوں کے ساتھ خاص نہیں تھا۔ اسلامی معاشرے کی خواتین بھی اس سلسلے میں بھرپور کردار ادا کرتی تھیں۔

ایک مرتبہ بزرگ خاتون سیدہ خولہ بنت ثعلبہ رضی اللہ عنہا امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو راستے میں ملیں تو انھوں نے کہا: ''عمر! مجھے اچھی طرح یاد ہے وہ زمانہ، جب تمھیں عمیر (چھوٹا عمر) کہا جاتا تھا۔ تم عکاظ کے میلے میں غلاموں کو لاٹھی سے ہانکتے پھرتے تھے، پھر بہت دن نہیں گزرے کہ تمھیں عمر کہا جانے لگا، پھر بہت دن نہیں گزرے کہ تمھیں امیر المومنین کہا جانے لگا۔ اس واسطے رعایا کے متعلق اللہ سے ڈرنا۔ اور یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا کہ جو آدمی وعید الٰہی سے ڈرتا ہے، ناممکن اس کے لیے ممکن ہوجاتا ہے۔ اور جو آدمی موت کا منظر نگاہوں میں رکھتا ہے وہ زندگی کو ضائع ہونے سے بچاتا ہے۔''

جارود نامی ایک صاحب امیر المومنین کے ہمراہ تھے۔ انھوں نے بنت ثعلبہ رضی اللہ عنہا سے کہا: ''خاتون! آپ نے امیر المومنین سے بہت کڑوی کسیلی باتیں کہہ لیں۔ اب بس کیجیے۔''

امیر المومنین نے جارود سے فرمایا: ''چھوڑیے۔ انھیں کہنے دیجیے۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ یہ کون ہیں؟ یہ خولہ ہیں، عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی اہلیہ، جن کی بات اللہ تعالیٰ نے آسمانوں پر سے سماعت فرمائی۔ یوں میرا تو بہت ہی زیادہ فرض بنتا ہے کہ ان کی بات غور سے سنوں۔''

ان کا اشارہ قرآن مجید کی اس آیت کی طرف تھا:

﴿ قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ﴾

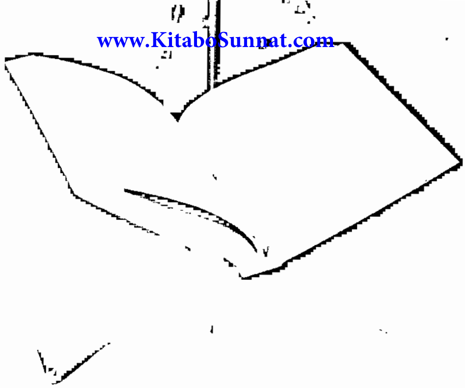
''اللہ نے سن لی اس عورت کی بات جو جھگڑا کرتی ہے تم سے اپنے شوہر کے بارے میں اور شکایت کرتی ہے اللہ سے۔''[1]

ریاست کے سیاسی، سماجی اور معاشی استحکام کو قائم رکھنا حاکم وقت ہی کی نہیں، عوام کی بھی ذمے داری ہے۔ حاکم وقت جادۂ حق سے انحراف کرتا ہے تو امت کا حق ہے کہ وہ اسے تھامے، سنبھالے اور پھر سے سیدھے راستے پر گامزن کر دے۔ امت احتساب کا حق ادا نہیں کرتی تو اس کا وبال پوری قوم پر پڑے گا اور تمام افرادِ امت کو اس کوتاہی کے خطرناک نتائج بھگتنے پڑیں گے۔

[1] المجادلة 58:1.

حضرت عثمان بن عفان

رضی اللہ عنہ



حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے متعلق قرآنِ مجید کی ایک آیت

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَمَّنْ هُوَ قٰنِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِی الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ؕ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝﴾

’’بھلا (یہ برابر ہوسکتا ہے اس کے) جو ہمیشہ عبادت کرتا ہے، رات کی گھڑیوں میں، سجدہ کرتے اور قیام کرتے۔ وہ ڈر رکھتا ہے آخرت کا اور امید کرتا ہے اپنے رب کی رحمت کی؟ تو کہہ دے کیا برابر ہوسکتے ہیں وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں اور وہ لوگ جو علم نہیں رکھتے؟ نصیحت پاتے ہیں بس عقل والے ہی۔‘‘ [1]

آیت کے متعلق مفسرین کے اقوال:

چند مفسرین جن میں بغوی، قرطبی، سیوطی اور واحدی جیسے ممتاز ائمہ شامل ہیں، انھوں نے اپنی اپنی کتب تفسیر میں لکھا ہے کہ یہ آیت حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے متعلق نازل ہوئی۔ [2]

---

[1] الزمر 9:39. [2] تفسیر البغوی: 58/6، وتفسیر القرطبی: 239/15، والدر المنثور للسیوطی: 323/5، وأسباب نزول القرآن للواحدي، ص: 388.

تو آیئے! حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی سیرت کا مطالعہ کرتے ہیں۔

حضرت عبدالرحمٰن بن خباب رضی اللہ عنہ کا بیان ہے:

''میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضر تھا۔ آپ جیش عسرت کے لیے صدقہ کرنے کی ترغیب دلا رہے تھے۔ عثمان بن عفان (رضی اللہ عنہ) اٹھے اور عرض کیا: ''یا رسول اللہ! میں پالانوں سمیت سو اونٹ راہ خدا میں پیش کرتا ہوں۔''

آپ نے دوبارہ صدقہ کرنے کی تلقین کی تو عثمان بن عفان (رضی اللہ عنہ) ایک مرتبہ پھر اٹھے اور عرض کیا: ''یا رسول اللہ! میں پالانوں سمیت دو سو اونٹ اللہ کی راہ میں پیش کرتا ہوں۔ اللہ کے رسول نے پھر صدقے کا اعلان کیا تو حضرت عثمان نے عرض کیا: اللہ کے رسول! میں تین سو اونٹ پالانوں سمیت اللہ کی راہ میں پیش کرتا ہوں۔''

تب میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ کہتے ہوئے منبر سے اتر آئے: ''عثمان آج کے بعد جو بھی عمل کریں، انھیں کچھ گناہ نہیں۔ عثمان آج کے بعد جو بھی عمل کریں، انھیں کچھ گناہ نہیں۔''[1]

حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ جس روز عثمان بن عفان (رضی اللہ عنہ) نے جیش عسرت کی تیاری کے لیے ساز و سامان فراہم کیا تھا، وہ ہزار اشرفی لیے خدمت نبوی میں حاضر ہوئے اور تمام اشرفیاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جھولی میں ڈال دیں۔ آپ ان اشرفیوں کو الٹتے پلٹتے اور کہتے جاتے۔'' آج کے بعد عثمان کا کوئی عمل انھیں نقصان نہیں پہنچائے گا۔''[2]

---

[1] جامع الترمذي، حديث: 3700، یہ روایت ضعیف ہے۔ جیش عسرت سے مراد مسلمانوں کا وہ لشکر ہے جو غزوۂ تبوک کے لیے روانہ ہوا تھا۔ [2] جامع الترمذي، حديث: 3701.

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ان اہل ایمان میں شامل تھے جو پہلے پہل اسلام لائے تھے۔ ایسے باکمال صحابۂ کرام کو قرآن نے سابقون اولون کا لقب دیا ہے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صاحبزادیوں رقیہ وکلثوم رضی اللہ عنہما کے شوہر نامدار۔ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا سے ان کے بیٹا ہوا جس کا نام تھا عبداللہ۔ اسی سے ان کی کنیت ابوعبداللہ ہوئی۔ عبداللہ چھ برس کا تھا کہ ایک روز مرغے نے اس کی آنکھ میں ٹھونگ ماردی۔ وہ سخت بیمار پڑا اور اس زخم کی تاب نہ لاکر وفات پاگیا۔

حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا نے وفات پائی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری صاحبزادی ام کلثوم رضی اللہ عنہا ان سے بیاہ دی۔ وہ بھی وفات پاگئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تیسری بیٹی ہوتی تو اسے بھی عثمان ہی سے بیاہ دیتا۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ بڑے حیادار آدمی تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا کہ سب سے سچے حیادار عثمان ہیں۔ [1]

ایک اور موقع پر فرمایا کہ میری امت میں سب سے زیادہ حیادار عثمان ہیں۔ [2]

اسی سلسلے کی ایک اور روایت ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمائی۔ انھوں

---

[1] فضائل الصحابة لأحمد بن حنبل:604/1، حدیث کی سند صحیح ہے۔ جامع الترمذي، حدیث: 3790. [2] صحیح الجامع الصغیر، حدیث:1002.

نے بتایا کہ ایک روز ابوبکر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ (ﷺ) کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت چاہی۔ آپ استراحت فرما تھے۔ جلباب (بڑی چادر، چوغہ) کا پلو ایک پنڈلی سے ہٹا ہوا تھا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اندر آنے کی اجازت دی۔ وہ تشریف لائے۔ جو بات چیت کرنی تھی، کی اور چل دیے۔ بعدازاں عمر رضی اللہ عنہ آئے اور حاضر خدمت ہونے کی اجازت چاہی۔ آپ نے انھیں بھی اجازت دی۔ وہ آئے۔ کچھ دیر بیٹھے رہے، پھر چل دیے۔ ان کے بعد اتفاق سے عثمان رضی اللہ عنہ آ گئے۔ انھوں نے حاضر خدمت ہونے کی اجازت چاہی تو رسول اللہ ﷺ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ جلباب کا پلو پنڈلی پر ڈال لیا۔ تب انھیں اجازت دی۔ وہ اندر آئے۔ کچھ وقت بیٹھے رہے، پھر چلے گئے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ سے پوچھا: ''یا رسول اللہ! آپ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی آمد پر اس طرح اٹھ کر نہیں بیٹھے جس طرح عثمان کی آمد پر اٹھے اور سیدھے ہو کر بیٹھے؟''

فرمایا: ''عثمان بڑا حیادار آدمی ہے۔ اگر میں لیٹے لیٹے اسے اندر آنے کی اجازت دیتا تو وہ شرما جاتا اور جو بات اسے کہنی تھی، وہ کہے بغیر لوٹ جاتا۔ عائشہ! میں ایسے آدمی سے کیوں نہ حیا کروں جس سے فرشتے بھی حیا کرتے ہیں۔''[1]

دورِ پُر فتن کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے جو پیش گوئیاں کی تھیں ان میں آپ نے بالخصوص حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا تھا کہ وہ فتنوں کے دور میں شاہراہ ہدایت پر گامزن رہیں گے۔ اس ضمن میں ایک روایت حضرت مرہ بن کعب رضی اللہ عنہ کی ہے۔ انھوں نے بیان کیا کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے آئندہ پیش آنے والے

---

[1] صحیح مسلم، حدیث:2402,2401.

فتنوں کے متعلق بتایا۔ آپ نے بتایا کہ دور پرفتن جلد آنے والا ہے۔ اتنے میں ایک صاحب ادھر سے گزرے جنھوں نے سر اور بدن پر چادر اوڑھ رکھی تھی۔ آپ نے ان کی طرف اشارہ کرکے فرمایا: ''یہ صاحب ان دنوں ہدایت پر ہوں گے۔''

میں فوراً اٹھا اور ان کی طرف بڑھا۔ دیکھا تو وہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ تھے۔ میں نے ان کا چہرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھیرا اور پوچھا: ''کیا یہ صاحب ان دنوں ہدایت پر ہوں گے؟'' آپ نے فرمایا: ''ہاں۔ (یہی)۔''[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو یہ بھی ہدایت کی تھی کہ فتنوں کے دور میں عثمان بن عفان اور ان کے رفقا کا ساتھ دیجیے گا۔ اس کے متعلق حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت آتی ہے۔ ان کا بیان ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''میرے بعد آپ کو اختلافات اور فتنوں کا سامنا ہوگا۔'' ایک صاحب نے پوچھا کہ یارسول اللہ! تب ہم کس کا ساتھ دیں۔ فرمایا: ''امین اور اس کے رفقا کا ساتھ دیجیے گا۔'' ساتھ ہی آپ نے عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ کیا۔''[2]

اہل سنت والجماعت کا متفقہ عقیدہ ہے کہ امت مسلمہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے بعد سب سے افضل آدمی حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ہیں۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں بھی صحابۂ کرام نے مراتب کی یہی تقسیم کر رکھی تھی کہ امت محمدیہ میں سب سے افضل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ ان کے بعد حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ افضل ترین ہیں۔ اور افضلیت کے لحاظ سے تیسرے درجے پر حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ فائز ہیں۔ اس سلسلے میں جلیل القدر صحابی ابن صحابی حضرت

---

[1] جامع الترمذي، حديث: 3704. [2] فضائل الصحابة لأحمد بن حنبل: 550/1، روایت کی سند صحیح ہے۔

عبداللہ بن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما کا مصدقہ بیان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہم ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کے برابر کسی کو نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے بعد عمر (رضی اللہ عنہ) اور عمر (رضی اللہ عنہ) کے بعد عثمان (رضی اللہ عنہ) کے برابر کسی کو نہیں سمجھتے تھے۔ ان تینوں کے بعد ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں مقام و مرتبہ کے لحاظ سے کسی کو کسی سے افضل نہیں کہتے تھے۔ [1]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے والد کا نام عفان تھا۔ وہ ابو عاص کے فرزند تھے۔ ابو عاص، امیہ کے بیٹے تھے۔ امیہ کا شمار دور جاہلیت کے سرکردہ افراد میں ہوتا تھا۔ وہ اپنے زمانے کا بڑا نامی سردار اور قبیلۂ قریش کی بہت نمایاں شاخ بنو امیہ کا جد امجد تھا۔ بنوامیہ تجارت پیشہ تھے۔ عفان بن ابی عاص بھی بڑی باقاعدگی سے تجارتی سفر پر جایا کرتے اور کثیر منافع کما کر لایا کرتے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی اکثر و بیشتر ان کے ہمراہ ہوتے تھے۔ ان کے ایک سفر کی روداد تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے۔ اس سفر میں انھیں جان کے لالے پڑ گئے تھے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ دور جاہلیت میں ایک مرتبہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے چچا فاکہ بن مغیرہ، صحابیِ رسول حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے والد عوف بن عبدعوف اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے والد عفان بن ابی عاص یمن کے تجارتی سفر پر روانہ ہوئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ بھی ہمراہ تھے۔ بنوجذیمہ کا ایک تاجر یمن میں وفات پا گیا تھا۔ یہ لوگ واپسی پر اس کا مال بھی لیتے آئے جو وہاں رہ گیا تھا۔ ارادہ تھا کہ تاجر کا مال وہ اس کے ورثا کے حوالے کریں گے۔ دیارِ بنو جذیمہ میں پہنچے تو ایک آدمی خالد بن ہشام اس مال کا دعویدار ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ مال

[1] صحيح البخاري، حديث:3698.

تاجر کے ورثا کو پہنچاتے، خالد بن ہشام آڑے آیا اور مال حاصل کرنا چاہا۔ ان تینوں نے اُسے مال دینے سے انکار کیا تو اس نے چھینا جھپٹی شروع کردی۔ اس کے ہمراہ اس کی قوم کے کئی اور افراد بھی تھے۔ فاکہ، عوف، عفان اور ان کے ہمراہیوں نے سخت مزاحمت کی۔ خالد بن ہشام کے ساتھیوں نے عوف بن عبد عوف اور فاکہ بن مغیرہ کو جان سے مار ڈالا۔ عفان، عثمان اور عبدالرحمٰن مال لے کر بچ نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔ [17]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اسلام میں بلند مقام و مرتبہ پانا تھا، اس لیے وہ زندہ سلامت رہے۔ وہ اسلام کے پہلے مہاجر تھے۔ جب مکہ میں مسلمانوں کا عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا تو انھوں نے مع اہل و عیال حبشہ کی طرف ہجرت کی۔

راہ خدا میں مال خرچ کرنے کی باری آئی تو انھوں نے روپیہ پانی کی طرح بہایا۔ لڑائی کی نوبت آئی تو دشمنان اسلام کے خلاف بڑی بے جگری سے لڑے۔ ان صحابۂ کرام میں شامل تھے جنھیں دنیا ہی میں جنت کی بشارت دے دی گئی تھی۔ ان برگزیدہ افراد میں سے ایک فرد تھے جنھیں تاحیات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مصاحبت خاص کا شرف حاصل رہا۔ وفات نبوی کے بعد خلیفۂ رسول کے مصاحب خاص بنے۔ خلیفۂ رسول تمام اہم معاملات میں ان سے ضرور مشورہ کرتے۔ عنان خلافت حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ہاتھ آئی تو بھی وہ خلیفۂ ثانی کے مشیران خاص میں شامل رہے۔ نامساعد حالات میں ہمیشہ مسلمانوں کی مدد کرتے۔

اسلام کے زیر سایہ

عثمان شام کے تجارتی سفر پر تھے۔ ان کے ہمدم دیرینہ طلحہ بن عبیداللہ اس سفر میں

[17] السيرة النبوية لابن هشام: 4/56.

ان کے ہمراہ تھے۔سفر سے واپسی پر ان دونوں نے ایک نخلستان میں پڑاؤ کیا تا کہ ذرا ستا کر تازہ دم ہو جائیں۔نخلستان کے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں انھیں نیند آنے لگی۔ دفعتاً ہاتف غیبی کی آواز آئی: ''ارے سونے والو! جاگو! مکہ میں محمد ظاہر ہو گئے۔''

وہ دونوں ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھے لیکن ایک دوسرے کو ہاتف غیبی کی آواز کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔ ہر ایک کو یہی خیال آیا کہ وہ آواز شاید اسی نے سنی ہے۔ دوسرے کو وہ آواز سنائی نہیں دی۔ان چند لفظوں نے ان کے دل و دماغ میں بسیرا کر لیا۔ باقی سفر انھی کے متعلق سوچتے ہوئے کٹا۔ وہ دونوں بڑی بے چینی سے منتظر رہے کہ کب مکہ پہنچیں گے اور کب ان الفاظ کی حقیقت معلوم کریں گے۔ مکہ کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی وہ حرمِ کعبہ میں پہنچے۔ اہل قریش معمول کی مجالس آراستہ کیے بیٹھے تھے۔محمد اور ان کی دعوتِ دینی تازہ ترین موضوع بحث تھا۔اسی موضوع پر چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔عثمان اور طلحہ نے بھی وہ تمام باتیں بڑی توجہ سے سماعت کیں۔ ہاتف غیبی کی آواز وہ سن چکے تھے۔ یوں نئے دین کی حقانیت پر وہ گویا پہلے سے ایمان لا چکے تھے۔عثمان نے طلحہ کا ہاتھ تھاما اور دونوں بیت محمد کی طرف چل دیے۔رسول اللہ ﷺ نے انھیں اسلام کی مقدس تعلیمات سے آگاہ کیا، قرآنی آیات پڑھ کر سنائیں، اسلام نے انسانوں کو جو حقوق دیے ہیں، ان کے متعلق بتلایا، اللہ تعالیٰ نے اسلام لانے کی بدولت انسانوں کو جو انعام و اکرام دینے کا وعدہ فرمایا ہے، اس کی خبر دی تو وہ دونوں اسلام لے آئے اور تصدیق کی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔ [11]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قبول اسلام پر سرداران قریش کو غصہ تو آیا لیکن وہ اُن کا کچھ

---

[11] الطبقات الکبریٰ لابن سعد: 55/3.

بگاڑ نہیں پائے کیونکہ وہ قریش کی معتبر شاخ بنو امیہ کے قابل فخر فرزند تھے۔ کوئی انھیں ہاتھ بھی لگاتا تو بنو امیہ کی تلواریں طیش میں آجاتیں۔ لیکن خود بنو امیہ کو یہ بات کیونکر ہضم ہوتی کہ ان کے نامی سردار کا بیٹا نئے دین کا لبادہ اوڑھ لے۔ سرداران قریش دارالندوہ میں سر جوڑ کر بیٹھے اور یہ امر متفقہ طور پر طے پایا کہ تمام قبائل کے سردار اپنے اپنے قبیلے کے ان افراد کی خبر لیں اور انھیں سبق سکھائیں جنھوں نے نئے دین کا لبادہ پہنا ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے بنو امیہ کے سردار حکم ابن ابی عاص پر دباؤ ڈالا گیا۔ اس نے ان کو پکڑا اور رسیوں میں جکڑ کر کہا کہ آباؤ اجداد کا مذہب چھوڑ کر نئے دین کے گن گاتے ہو! واللہ! اس وقت تک یہ رسیاں نہیں کھولوں گا جب تک نئے دین کا لبادہ نہیں اتارو گے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی قسم کھا کر کہا: واللہ! یہ دین کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ [1]

حکم نے دیکھا کہ یہ لڑکا کسی طرح نہیں ٹلتا تو اس نے رسیاں کھول کر انھیں آزاد کر دیا۔ حکم نے تو چھوڑ دیا لیکن دیگر سرداران قریش نے انھیں نہیں چھوڑا۔ وہ انھیں اور اسلام کے دوسرے نام لیواؤں کو برابر ستاتے رہے۔ انھیں طرح طرح کی ایذائیں دیتے رہے۔ ظلم وستم کا نشانہ بناتے رہے۔ ان کے لیے عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا۔ مکہ میں ان کا جینا دوبھر ہوگیا۔ ایک ایک پل گزارنا قیامت معلوم ہوتا تھا۔ تبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ حبشہ کی طرف ہجرت کر جائیں۔ سرزمین حبشہ جہاں ان دنوں ایک انصاف پسند بادشاہ حکومت کرتا تھا، اس کے ملک میں کسی پر ظلم نہیں ہوتا تھا۔ وقتی طور پر اہل کفر کی ایذا رسانیوں سے بچنے کا ایک یہی راستہ تھا جو مسلمانوں نے اپنایا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی اپنی زوجہ محترمہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کے

[1] الطبقات الکبریٰ لابن سعد: 55/3.

ہمراہ حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ وہ اس دور دراز ملک میں اطمینان وسکون سے رہنے لگے۔ اب وہ بے روک ٹوک اللہ کی عبادت کر سکتے تھے۔ شاہ حبشہ نجاشی نے ان کی میزبانی کے فرائض بڑی تندہی سے انجام دیے۔ اس نے نئے مہمانوں کے آرام وسکون کا ہر طرح خیال رکھا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کی اہلیہ محترمہ حبشہ میں قیام پذیر رہے تا آنکہ اہل قریش نے یہ جھوٹی خبر پھیلائی کہ انھوں نے اسلام قبول کر کے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری کا اقرار کرلیا ہے۔ مہاجرین حبشہ یہ خبر پا کر خوشی خوشی اپنے وطن لوٹے۔ یہاں پہنچے تو پتہ چلا کہ اشراف قریش کے قبول اسلام کی خبر جھوٹی تھی۔ بہت پریشان ہوئے کہ اب کیا کریں اور کہاں جائیں۔ مکہ میں رہیں یا واپس چلے جائیں۔ اس پریشانی کا حل جلد نکل آیا۔ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یثرب کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت مل گئی، چنانچہ تمام مسلمان یکے بعد دیگرے یثرب کی طرف ہجرت کر گئے۔ یثرب میں یہودیوں کا بڑا اثر ورسوخ تھا۔ اوس وخزرج کی باہمی لڑائیوں سے انھوں نے بہت فائدہ اٹھایا اور خاصی دولت بٹوری تھی۔ میٹھے پانی کا واحد کنواں ایک یہودی کی ملکیت تھا۔ وہ کنویں کا پانی فروخت کیا کرتا اور سینکڑوں روپے نفع کماتا تھا۔

کئی مسلمانوں نے نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس یہودی کی سنگدلی اور دریدہ دلیری کی شکایت کی اور بتایا کہ وہ مردود چند قطرے پانی کے عوض بیسیوں روپے بٹور لیتا ہے۔ آپ نے تمام مسلمانوں کو بلا بھیجا تا کہ اس مسئلے کا کوئی حل تلاش کیا جا سکے۔ مشاورت کے بعد یہی طے پایا کہ کنواں خرید لیا جائے۔ مسلمانوں میں جو افراد اصحاب ثروت تھے، آپ نے انھیں اس کی ترغیب دلائی، چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ یہودی سے کنویں کا

سودا کرنے اس کے ہاں گئے۔ یہودی نے کہا کہ تمام کنواں تو میں نہیں بیچنے کا۔ آدھا کنواں لینا ہے تو بات کرو۔ انھوں نے آدھا کنواں بارہ ہزار درہم کو خریدا اور مسلمانوں کے لیے وقف کر دیا۔ یہودی سے کہا کہ یا تو اتنا پانی مجھے روزانہ دے دیا کرو جو دو بھری پُری بستیوں کے لیے کافی ہو یا پھر ایک دن کنویں پر میرا حق ہوگا اور ایک دن تمھارا۔

وہ بولا: ایک دن کنویں پر تمھارا حق ہوگا اور ایک دن میرا۔

بات پوری طرح طے پا گئی۔ جس روز کنویں پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دن ہوتا، تمام مسلمان اتنا پانی نکال لیتے کہ اگلے دو دن آرام سے گزر جاتے اور مزید پانی کی ضرورت نہ پڑتی۔ یہودی کی باری آتی تو کوئی مسلمان پانی لینے نہ آتا۔ یوں اسے خسارہ ہونے لگا۔ اس نے سوچا تمام کنواں بیچ دینا ہی بہتر ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہنے لگا: ''تم نے تو میرا کنواں خراب کر دیا ہے۔ اب باقی آدھا بھی خرید لو۔'' انھوں نے مزید آٹھ ہزار درہم دے کر باقی کنواں بھی خرید لیا۔[1]

یہ پہلا موقع تھا کہ مسلمانانِ مدینہ کے لیے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا بھرپور ہمدردانہ کردار سامنے آیا۔ انھیں یقین تھا کہ وہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے جو روپیہ خرچ کریں گے، وہ رائیگاں نہیں جائے گا۔ انھیں اللہ تعالیٰ کے وعدے پر بھروسہ تھا کہ وہ ان کا روپیہ سات سے سات سو گنا کر کے لوٹائے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۗ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝﴾

''ان لوگوں کی مثال جو اللہ کی راہ میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں، اس دانے کی

[1] الاستيعاب فى معرفة الأصحاب، ترجمه عثمان بن عفان .

سی ہے جس میں سے سات بالیاں نکلیں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں اور اللہ جس کے لیے چاہے (اجر) بڑھا دیتا ہے۔ اور اللہ بڑی وسعت والا، خوب جاننے والا ہے۔"[1]

نبیِ کریم ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو آپ کی اولین ترجیح یہ تھی کہ مدینہ منورہ میں مسجد تعمیر کی جائے۔ مسلمانوں کو بھی مسجد کی اہمیت کا احساس تھا، چنانچہ زمین خرید کر تعمیر کا آغاز کر دیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے بنفسِ نفیس تعمیراتی کاموں میں حصہ لیا۔ مہاجرین و انصار نے بھی خوب محنت سے کام کیا۔ مسجد کی تعمیر مکمل ہوئی تو مسلمانوں کی کئی ضروریات پوری ہونے لگیں۔ وہ مسجد میں دین کا علم حاصل کرتے۔ اہم معاملات کے متعلق مسجد ہی میں مشاورت کرتے۔ یہیں سے لشکر روانہ ہوتے۔ دعوت و تبلیغ کے لیے جانے والے افراد بھی یہیں سے رختِ سفر باندھتے۔ غرضیکہ مسجد ان کی تمام دینی و سماجی سرگرمیوں کا مرکز بن گئی۔

ابتدا میں مسلمانوں کی تعداد چونکہ کم تھی، اس لیے مسجد کا دامن خاصا وسیع معلوم ہوتا تھا۔ لیکن جب لوگوں نے جوق در جوق آ کر دینِ اسلام قبول کیا اور مسلمانوں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہو گیا تو مسجد تنگیِ داماں کی شکایت کرنے لگی۔ نمازوں کے اوقات میں بعض دفعہ لوگوں کو نماز کے لیے جگہ بھی نہیں ملتی تھی۔ خود رسول اللہ ﷺ کو بھی اس امر کا شدید احساس تھا کہ اب مسجد کی توسیع ہونی چاہیے، چنانچہ آپ نے مسلمانوں سے کہا: "ہماری مسجد کو وسیع کون کرے گا؟"[2]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور پانچ ستونوں کی وسیع جگہ خرید کر خدمتِ نبوی

---

[1] البقرة 2:261. [2] الاستيعاب في معرفة الأصحاب: 106/3.

میں پیش کی۔ یوں مسجد کی وسعت داماں میں خاطر خواہ اضافہ ہوگیا اور تمام مسلمان بآسانی نماز پڑھنے لگے۔ ہجرت مدینہ کے بعد مسجد کی توسیع کا یہ دوسرا فلاحی کام تھا جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں انجام پایا۔

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اور بیعت رضوان

ہجرت کے چھٹے برس ذیقعدہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ کرنے کے ارادے سے مکہ روانہ ہوئے۔ مدینہ کے گرد و نواح میں بسنے والے بدوؤں کو بھی آپ نے ہمراہی کی دعوت عام دی۔ خدشہ تھا کہ سرداران قریش سختی سے آڑے آئیں گے اور مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔

قربانی کے جانور بھی ساتھ لے گئے۔ اور عمرے کا احرام باندھا تا کہ اہل قریش کو پتہ چلے کہ ان کا ارادہ صرف بیت اللہ کی زیارت کرنے کا ہے۔ چلتے چلتے عسفان میں پہنچے تو بشر بن سفیان کعبی ملے۔ انھوں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! قریش کو جونہی آپ کی آمد کی خبر ملی تھی، وہ شیروں کی کھالیں پہنے، عورتوں اور بچوں کو بھی ہمراہ لیے، ذی طویٰ میں آن بیٹھے تھے۔ انھوں نے عہد کر رکھا تھا کہ آپ کو مکہ میں کبھی داخل نہیں ہونے دیں گے۔ خالد بن ولید کے گھڑ سوار دستے کو انھوں نے کراع غمیم تک بھیج دیا ہے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت آزردہ لہجے میں فرمایا:

''افسوس! قریش کو جنگ وجدل نے تباہ و برباد کر ڈالا۔ کیا ہی اچھا ہوتا جو وہ مجھے عرب کے دوسرے لوگوں سے لڑنے بھڑنے دیتے۔ اگر وہ مجھ پر غالب آجاتے تو قریش کا مقصد پورا ہوجاتا۔ اور اگر اللہ تعالیٰ مجھے لوگوں پر غالب کر دیتا تو وہ بھی اسلام قبول

کر لیتے اور صحیح سلامت بھی رہتے۔ اور اگر وہ اسلام قبول نہ کرتے، تب بھی قوت کے ساتھ تو لڑتے! قریش نے کیا سمجھ رکھا ہے! اللہ کی قسم! میں ان سے لڑتا رہوں گا تا آنکہ اللہ تعالیٰ اس دین کو غالب فرما دے یا پھر میری گردن تن سے جدا ہو جائے۔''

پھر لوگوں سے مخاطب ہو کر دریافت فرمایا: ''کون ہے جو ہمیں اس راستے کے علاوہ کسی اور راستے سے لے جائے جس پر وہ لوگ بیٹھے ہیں؟''

قبیلہ اسلم کے ایک آدمی نے کہا: ''یارسول اللہ! میں لے جاتا ہوں۔''

اس نے انھیں گھاٹیوں کے بیچوں بیچ ایک دشوار گزار راستے پر ڈال دیا۔ وہ راستہ طے پایا تو لوگ تھک کر چور ہو گئے۔ وادی کے آخری کنارے پر پہنچے تو رسول اللہ ﷺ نے لوگوں سے فرمایا: ''کہیے کہ ہم اللہ سے مغفرت چاہتے ہیں اور اس کے حضور توبہ کرتے ہیں۔''

تمام لوگوں نے حسب ارشاد یہ الفاظ دہرائے تو آپ نے فرمایا: ''واللہ! حطہ کے یہی الفاظ ہیں جن کے کہنے کا مطالبہ بنی اسرائیل سے کیا گیا تھا لیکن وہ انھیں زبان پر نہیں لائے تھے۔''[1]

ثنیہ مرار میں پہنچے تو آپ ﷺ کی اونٹنی اچانک بیٹھ گئی۔ لوگوں نے کہا اونٹنی تو ہٹ کرنے لگی۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ یہ ہٹ نہیں کر رہی۔ نہ اس کی یہ عادت ہے۔ اسے تو فیل (ہاتھی) کے روکنے والے نے روک لیا ہے۔ آج اگر قریش مجھے ایسی معاملت کی طرف بلائیں گے جس میں وہ مجھ سے صلہ رحمی کرنے کو کہیں گے تو میں ان سے وہ معاملت ضرور کروں گا، پھر لوگوں سے فرمایا کہ یہیں پڑاؤ کر یے۔ کسی نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! وادی بھر میں پڑاؤ کرنے کو پانی نہیں۔ آپ نے اپنے ترکش سے

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 361/3، والكامل لابن الأثير: 200/2.

ایک تیر نکالا، ایک صحابی کو دیا۔ وہ تیر لیے ایک تباہ شدہ کنویں میں اترے اور اس میں تیر گاڑ دیا۔ کنویں میں سے بھرپور پانی نکلنے لگا۔

رسول اللہ ﷺ نے خیمہ زن ہو کر ذرا اطمینان لیا تو بدیل بن ورقا خزاعہ کے چند افراد کو ہمراہ لیے حاضر خدمت ہوا۔ انھوں نے آپ سے بات چیت کی اور پوچھا کہ آپ کیوں آئے ہیں۔ آپ نے انھیں بتایا کہ ہم جنگ کرنے نہیں آئے ہم تو بیت اللہ کی زیارت کرنے اور اس کی عزت و حرمت کو خراج تعظیم پیش کرنے آئے ہیں۔ بُدیل بن ورقا اور اس کے ہمراہی واپس گئے۔ انھوں نے قریش سے کہا کہ تم بے صبری سے کام لے رہے ہو۔ محمد لڑائی کرنے نہیں آیا۔ وہ تو بیت اللہ کی زیارت کرنے آیا ہے۔ قریش نے بدیل بن ورقا اور اس کی ساتھیوں کو ڈانٹ پلائی اور کہا کہ اگر وہ لڑائی کرنے نہیں آیا تو بھی وہ مکہ میں زبردستی داخل نہیں ہو پائے گا۔ ورنہ تو عرب کے لوگ ہماری ہنسی اڑائیں گے اور باتیں بنائیں گے۔

ابن ورقا کے بعد قریش کے چند اور سفیر رسول اللہ ﷺ سے بات چیت کرنے آئے۔ ان میں عروہ بن مسعود ثقفی بھی شامل تھا۔ اس نے واپس آکر قریش سے کہا: ''قریش کے لوگو! میں نے قیصر و کسریٰ اور نجاشی کی بادشاہت قریب سے دیکھی ہے۔ واللہ! محمد کے اصحاب اس کا جتنا احترام کرتے ہیں میں نے کسی قوم کو اپنے بادشاہ کا اتنا احترام کرتے نہیں دیکھا۔ میں ایسی قوم کا مشاہدہ کر کے آرہا ہوں جو محمد کو کبھی اکیلا نہیں چھوڑے گی، اس لیے خوب سوچ سمجھ کر اقدام کرنا۔''[115]

اُدھر رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ مکہ جائیے اور

[115] السيرة النبوية لابن هشام:3/363، والكامل لابن الأثير:2/202.

اشراف قریش کو بتائیے کہ ہم کاہے کو آئے ہیں۔ انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! خدشہ ہے کہ وہ مجھے گزند پہنچائیں گے کیونکہ مکہ میں بنو کعب (قبیلۂ عمر، بنو عدی بن کعب) کا کوئی سردار نہیں جو وہاں میرا دفاع کرے۔ قریش میری عداوت اور شدت طبع سے واقف ہیں۔ میں آپ کو ایک ایسا آدمی بتاتا ہوں جو اس کام کے لیے زیادہ موزوں رہے گا۔ مکہ میں اس کا اثر و رسوخ مجھ سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ آدمی ہے عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ۔

نبیِ کریم ﷺ کو ان کی یہ بات پسند آئی۔ آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو طلب فرمایا۔ وہ تشریف لائے تو آپ نے ان سے کہا کہ ابوسفیان اور اشراف قریش کے ہاں جایئے اور ان سے کہیے کہ ہم جنگ کرنے نہیں آئے۔ ہم تو محض بیت اللہ کی زیارت کرنے اور اس کی حرمت کو خراج تعظیم پیش کرنے آئے ہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حسب ارشاد مکہ روانہ ہوئے۔ شہر کے قریب پہنچے تو بنو امیہ کے سردار ابان بن سعید بن عاص سے ملاقات ہوئی۔ اس نے آپ کو اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ آپ اس کے زیر امان مکہ میں داخل ہوئے۔ ابوسفیان اور دیگر اشراف قریش کو رسول اللہ ﷺ کا پیغام دیا۔ انھوں نے آپ سے کہا کہ اگر آپ بیت اللہ کا طواف کرنا چاہتے ہیں تو کر لیجیے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ سے پہلے میں کعبہ کا طواف نہیں کرنے کا۔ سرداران قریش نے ان سے کہا کہ اب آپ آ ہی گئے ہیں تو چند دن یہیں رکیے، چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ چند روز کے لیے مکہ میں ٹھہر گئے۔ ادھر مسلمانوں میں یہ خبر اڑی کہ عثمان کو قتل کر دیا گیا، چنانچہ غم وغصے کی شدید لہر نے انھیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ نبیِ کریم ﷺ نے صحابۂ کرام سے فرمایا: ''اب ہم ان سے بدلہ لے کر ہی ٹلیں گے۔''[1]

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 364/3، والكامل لابن الأثير: 203/2.

آپ نے تمام لوگوں کو اِس امر کی بیعت کے لیے بلایا کہ عثمان کے خون کا بدلہ لیں گے اور مرتے دم تک لڑیں گے۔ یہ اپنی نوعیت کی منفرد بیعت تھی جو بیعت رضوان کہلاتی ہے۔ قرآن مجید میں اس بے مثال بیعت کا نہایت تفصیلی ذکر آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس بیعت کے تعلق سے مسلمانوں کے جرأت مندانہ کردار کو بے حد سراہا اور صلح حدیبیہ کی حکمت بھی بیان فرمائی۔ ارشاد ہوا:

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ○ وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ○ وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ ۚ وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ○ وَّاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ○ وَلَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ○ سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ○ وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ○ هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ ؕ وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَـُٔوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۚ لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ○﴾

”البتہ تحقیق اللہ مومنوں سے راضی ہوگیا جب وہ درخت کے نیچے آپ سے

بیعت کر رہے تھے، چنانچہ ان کے دلوں میں جو (خلوص) تھا، وہ اس نے جان لیا تو اس نے ان پر طمانیت وتسکین نازل کی اور بدلے میں انھیں قریب کی فتح دی۔ اور بہت سی غنیمتیں بھی (عطا کیں) جو وہ حاصل کریں گے۔ اور اللہ نہایت غالب، خوب حکمت والا ہے۔ اور اللہ نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ فرمایا ہے کہ تم انھیں حاصل کرو گے، چنانچہ اس نے جلد ہی وہ تمھیں عطا کر دیں اور لوگوں کے ہاتھ تم سے روک دیے تاکہ یہ مومنوں کے لیے ایک نشانی ہو جائے اور تاکہ وہ تمھیں صراط مستقیم کی ہدایت دے۔ اور (اللہ نے) دوسری غنیمتوں کا بھی (وعدہ کیا) جن پر تم قدرت نہیں رکھتے تھے (مگر) اللہ نے ان کا احاطہ کر رکھا ہے اور اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے۔ اور اگر وہ لوگ، جنھوں نے کفر کیا تم سے لڑتے تو یقیناً وہ پیٹھوں کے بل پھر جاتے، پھر وہ کوئی دوست اور کوئی مددگار نہ پاتے۔ یہ اللہ کا طریقہ ہے جو پہلے سے چلا آرہا ہے اور آپ اللہ کے طریقے میں ہرگز کوئی تبدیلی نہیں پائیں گے۔ اور وہ (اللہ) ہی تو ہے جس نے وادئ مکہ میں ان (کفار) کے ہاتھ تم سے اور تمھارے ہاتھ ان سے روک دیے بعد اس کے کہ اس نے تمھیں ان پر کامیابی دی تھی اور اللہ اسے خوب دیکھ رہا ہے جو تم عمل کرتے ہو۔ یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے کفر کیا اور تمھیں مسجد حرام سے روکا اور قربانی کے جانوروں کو بھی اپنی قربان گاہ تک پہنچنے سے روکے رکھا اور اگر (مکہ میں کچھ) مومن مرد اور مومن عورتیں نہ ہوتے جن (کے ایمان) کو تم نہیں جانتے، (اگر یہ خطرہ نہ ہوتا) کہ تم انھیں روند ڈالو گے، پھر بے خبری میں ان (کے قتل) کی وجہ سے تمھیں تکلیف پہنچتی (تو تمھیں لڑنے کی اجازت دے دی جاتی لیکن ایسا نہیں کیا

گیا) تاکہ اللہ جسے چاہے اپنی رحمت میں داخل کرے۔ اگر وہ (مومن اور کافر) الگ الگ ہوتے تو ان میں جو کافر تھے، ہم انھیں نہایت دردناک عذاب دیتے۔"[1]

ان آیات کی تفسیر لکھتے ہوئے سید قطب رقمطراز ہیں:

"آج چودہ سو سال بعد میں جب اس مقدس لمحے کا تصور کرتا ہوں، جس وقت اللہ تعالیٰ نے رسول امین کو اہل ایمان کے متعلق بتایا کہ وہ ان سے راضی ہے، وہ ان کے طرز عمل سے خوش ہوا ہے، میں اس بے مثل لحظے کا تصور کرتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ مسلمانوں کو رسول کریم ﷺ کی زبانی جب یہ مژدۂ جاں فزا ملا ہوگا تو ان کی خوشی اور سرشاری کا کیا ٹھکانہ ہوگا۔ ان باسعادت افراد کو جب یہ آیات پڑھ کر سنائی گئی ہوں گی تو ان میں سے ہر ایک کو اطمینان وسکون کا بے طرح احساس ہوا ہوگا۔ اعتماد و یقین کی لہریں پورے بدن میں دوڑ گئی ہوں گی۔ ایمان و ایقان کی بالیدگی روح کی گہرائیوں تک اتر گئی ہوگی۔"[2]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بیعت رضوان میں شریک نہیں تھے کیونکہ انھیں مکہ میں ٹھہرا لیا گیا تھا۔ لیکن چونکہ وہ اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر جنگ بندی میں شریک ہوئے تھے، اس لیے انھیں خاطر خواہ انعام ملنا چاہیے تھا۔ ان کے انعام کی صورت یہ ہوئی کہ ان کی طرف سے خود رسول اللہ ﷺ نے بیعت کی۔ آپ نے اپنا ایک ہاتھ دوسرے پر رکھا اور فرمایا کہ یہ عثمان کا ہاتھ ہے۔ آپ اپنے رفقائے کرام کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ آپ نے ہمیشہ ان کی عزت افزائی کی اور انھیں بلند مقام و مرتبہ کا مستحق گردانا۔

بیعت رضوان کے تین برس بعد نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کو ہدایت کی کہ رومیوں

[1] الفتح 48:25-18. [2] فی ظلال القرآن: 504/7.

سے نبرد آزمائی کی تیاری کریے۔ اس غزوے میں بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا فیاضانہ کردار کھل کر سامنے آیا۔ اس دریا دلی سے روپیہ خرچ کیا کہ مثال نہیں ملتی۔

مسلمانوں کو دراصل اطلاع ملی تھی کہ نصرانی عرب، شاہ روم ہرقل کے ساتھ مل کر مدینہ پر حملہ آور ہونا چاہتے ہیں۔ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منصوبہ بنایا کہ وہ تو ہم پر حملہ آور ہوتے ہیں یا نہیں، ہمی آگے بڑھ کر ان سے دو دو ہاتھ کیے لیتے ہیں۔ سخت گرمی کا موسم تھا۔ ہر سو قحط چھایا تھا۔ لوگ نہایت تنگدستی کا شکار تھے۔ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اصحاب ثروت کو توجہ دلائی کہ جنگ کی تیاری کے لیے آپ کو مقدور بھر روپیہ اور ساز وسامان فراہم کرنا چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلقین پر دولت مند تو رہے ایک طرف، ناداروں نے بھی جو کچھ کمایا تھا، لا کر پیش کر دیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے گھر کا تمام سامان لا کر قدموں میں ڈال دیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تین سو اونٹ پالانوں سمیت پیش کر دیے۔ بعد ازاں ہزار اشرفیاں لا کر نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جھولی میں ڈال دیں۔ آپ ان اشرفیوں کو الٹتے پلٹتے اور کہتے جاتے: ''آج کے بعد عثمان کا کوئی عمل انھیں نقصان نہیں پہنچائے گا۔''[1]

وفات نبوی کے بعد بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فیاضی کا یہ طریقہ اپنائے رکھا اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے منصوبوں پر برابر خرچ کرتے رہے۔

اس سلسلے کا ایک یادگار واقعہ یہ ہے کہ خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ایک مرتبہ سخت قحط پڑا۔ قحط کے دوران میں ایک روز لوگ خلیفۂ رسول کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ رسول اللہ کے خلیفہ! آسمان نے بارش نہیں

---

[1] جامع الترمذي، حديث:3701.

برسائی۔ زمین نے سبزہ نہیں اگایا۔ لوگ تو موت کا انتظار کر رہے ہیں۔ ایسے میں آپ ہی بتائیے کہ ہم کیا کریں۔ فرمایا: ''گھروں کو جاؤ اور صبر و ہمت سے کام لو۔ امید ہے کہ آج شام ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ کوئی وسیلہ پیدا کرے گا۔''

آپ کی پیش گوئی پوری ہوئی۔ اسی روز سہ پہر کو خبر ملی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ایک تجارتی قافلہ شام سے آ رہا ہے۔ تجارتی قافلہ مدینہ پہنچا تو لوگ اہل قافلہ کا استقبال کرنے گھروں سے باہر نکل آئے۔ قافلے میں سو اونٹ شامل تھے جن پر گندم اور روغن زیتون کے علاوہ منقیٰ بھی لدا ہوا تھا۔ تمام اونٹ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دروازے پر بٹھائے گئے۔ مدینہ کے بڑے بڑے تاجر اونٹوں پر لدا تجارتی سامان خریدنے آ پہنچے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تاجروں سے دریافت کیا کہ آپ مجھے کتنا منافع دیتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ ایک روپیہ کے سامان کے عوض ہم آپ کو دو روپیہ دیتے ہیں۔ فرمایا: ''مجھے تو اس سے زیادہ کی پیش کش ہوئی ہے۔'' تاجروں نے کہا تب ایک روپیہ کے عوض چار روپیہ دیتے ہیں۔ فرمایا: ''مجھے تو اس سے بھی زیادہ منافع مل رہا ہے۔'' تاجروں نے کہا کہ پانچ روپیہ۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھے اس سے بھی زیادہ مل رہا ہے۔ تاجروں نے حیران ہو کر پوچھا کہ ابوعمرو! مدینہ کے تمام تاجر یہاں آئے ہیں۔ آپ کو اتنا منافع اور کون دے رہا ہے؟ فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک روپیہ کے بدلے دس روپیہ دینے کا وعدہ کیا ہے۔ میں اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا کر ان اونٹوں کا تمام سامان ضرورت مند مسلمانوں کے لیے صدقہ کرتا ہوں۔''[1]

خلیفۂ ثانی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو جب تیز دھار زہریلے خنجر کے پے در پے

---

[1] التمھید وا لبیان للمالقی، ص:243.

وار کر کے شدید زخمی کر دیا گیا تو انھوں نے نیا خلیفہ نامزد کرنے کے بجائے چھ رکنی مجلس شوریٰ تشکیل دے دی اور مجلس شوریٰ کے اراکین سے کہا کہ مشاورت کے بعد خود میں سے کسی ایک کو خلیفہ نامزد کر لیجیے گا۔ مجلس شوری کے چھ اراکین کا انتخاب کرتے وقت انھوں نے اس معیار کو ملحوظ خاطر رکھا تھا کہ رسول اللہ ﷺ ان افراد سے تاحیات راضی رہے تھے۔ خلیفۂ ثانی کی انتخاب کردہ مجلس شوری کے ایک رکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ خلیفۂ ثانی نے مرتے وقت مجلس شوریٰ کے اراکین کو ہدایت کی تھی کہ زیادہ سے زیادہ تین روز میں خلیفہ نامزد کر لیجیے گا۔ اُن کی وفات کے بعد اگلے تین دن اسی مشاورت میں صرف ہوئے اور نئے خلیفہ کے طور پر حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا انتخاب عمل میں آیا۔ یوں وہ اسلام کے تیسرے خلیفۂ راشد قرار پائے۔

خلیفۂ ثالث حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو سپردِ خاک کرنے کے فوراً بعد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں اور بعض روایات کے مطابق ضحاک بن قیس کی بہن فاطمہ فہریہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں اراکین شوریٰ کا اجلاس منعقد ہوا۔ پہلے مرحلے میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے اراکین شوریٰ کو پیشکش کی کہ چھ میں سے تین کا انتخاب کر لیجیے۔ اس پر حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میں علی کے حق میں دستبردار ہوتا ہوں۔'' مجلس شوریٰ کے ایک رکن حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں جبکہ دوسرے رکن حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے حق میں دستبرداری کا اعلان کیا۔

اب خلافت کے لیے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے نامزد کردہ تین اصحاب باقی رہ گئے۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی بن ابی طالب کو مخاطب کر کے فرمایا: ''آپ دونوں حضرات میں سے جو بھی منصب خلافت سے دستبردار ہوتا ہے، ہم انتخاب خلیفہ کا معاملہ اس کے سپرد کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ

اس کا نگہبان ہوگا اور حقوق اسلام کی پاسداری اس پر لازم ہوگی۔ تو کیا وہ منصب خلافت کے لیے ہم میں سے افضل ترین آدمی کا انتخاب کرے گا؟'' ان کے اس سوال پر دونوں حضرات خاموش رہے اور کوئی جواب نہیں دیا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ خود ہی گویا ہوئے: ''کیا آپ انتخابِ خلیفہ کی ذمے داری مجھ پر ڈالتے ہیں؟ بخدا! مجھ پر لازم ہے کہ آپ دونوں میں سے بہترین آدمی کا انتخاب کروں اور اس سلسلے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھوں۔''

دونوں شیوخ نے فوراً رضا مندی کا اظہار کیا اور کہا: بہت خوب، یہ ذمے داری آپ ہی نبھائیے۔ [1]

یہ مجلس یہیں برخاست ہوئی۔ اگلے مرحلے میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے عام مشاورت کا آغاز کیا۔ یہ سلسلہ اگلے دو روز تک جاری رہا۔ انھوں نے مدینہ منورہ کے تمام اکابر صحابہ سے مشورہ کیا۔ افواج کے سپہ سالاروں کی رائے معلوم کی۔ وزرائے خلافت کی قیمتی آرا سے استفادہ کیا۔ مدینہ آنے والے ہر صاحبِ شعور آدمی سے مشاورت کی۔ باپردہ فہیم خواتین کی بھی رائے لی۔ مدینہ منورہ کے بچے اور غلام تک اس مشورے میں شریک کیے گئے۔ اکثریت کی رائے یہی تھی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خلیفہ نامزد کیا جائے۔ اس دوران میں حضرت ابنِ عوف رضی اللہ عنہ نے مناسب سمجھا کہ دونوں شیوخ سے بھی مشورہ کر لیا جائے۔ انھوں نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''اگر میں آپ کی بیعت نہ کروں تو آپ کسے نامزد کریں گے؟'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ عثمان کو۔ یہی سوال انھوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بھی کیا تو انھوں نے جواباً فرمایا: ''اس صورت میں، میں علی کو نامزد کروں گا۔''

[1] صحيح البخاري، حديث: 3700.

مشاورت کرتے کرتے وہ رات آن پہنچی جس کی اگلی صبح خلیفہ کے متعلق حتمی فیصلہ ہونا تھا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ رات کے پچھلے پہر اپنے بھانجے حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ کے گھر پہنچے۔ دروازے پر دستک دی۔ مسور رضی اللہ عنہ سو رہے تھے۔ بار بار دروازہ کھٹکھٹانے پر بیدار ہوئے۔ حضرت ابن عوف رضی اللہ عنہ نے حیران ہو کر فرمایا: "مسور! تم سو رہے ہو! میں تو یہ تین راتیں بہت کم سویا ہوں۔" فرمایا: "جاؤ۔ زبیر اور سعد کو بلا لاؤ۔" حضرت مسور رضی اللہ عنہ گئے اور دونوں بزرگوں کو بلا لائے۔ حضرت ابن عوف رضی اللہ عنہ نے ان سے مشاورت کی۔ بعدازاں مسور رضی اللہ عنہ سے فرمایا: "جاؤ علی کو بلا لاؤ۔" وہ گئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلا لائے۔ حضرت ابن عوف رضی اللہ عنہ نے ان سے رات گئے تک طویل بات چیت کی۔ وہ رخصت ہوئے تو آپ نے حضرت مسور بن مخرمہ سے فرمایا کہ اب جاؤ اور عثمان کو بلا لاؤ۔

وہ گئے اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو بلا لائے۔ حضرت ابن عوف رضی اللہ عنہ نے ان سے بھی طویل مشاورت کی تا آنکہ مؤذن نے فجر کی اذان کہہ دی۔ نماز فجر کے بعد مجلس شوریٰ کے اراکین منبر کے قریب ہی تشریف فرما ہوئے۔ حضرت ابن عوف رضی اللہ عنہ نے تمام مہاجرین و انصار اور وزرائے خلافت کو بلا بھیجا۔ وزرا میں شام کے وزیر حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ، حمص کے وزیر حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ عنہ، کوفہ کے وزیر حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ، بصرہ کے وزیر حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور مصر کے وزیر حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ شامل تھے۔ وزرائے خلافت حج کے موقع پر مکہ تشریف لائے تھے۔ حج کے بعد وہ امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ہمراہ مدینہ منورہ چلے آئے تھے۔ بعدازاں امیر المومنین کا سانحۂ شہادت پیش آ گیا تو وہ نئے خلیفہ کے انتخاب تک یہیں ٹھہر گئے تھے۔

یہ 29 ذی الحج 23ھ/6 نومبر 644ء کی صبح تھی۔ تمام اصحاب مسجد نبوی میں تشریف لے آئے تو حضرت ابن عوف رضی اللہ عنہ قدم قدم چلتے ہوئے آگے بڑھے اور منبر رسول پر جلوہ افروز ہوئے۔ ابھی کچھ کہنے نہیں پائے تھے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا قاصد حاضر خدمت ہوا اور چپکے سے ان کا پیغام دیا کہ امت محمدیہ کی خیر خواہی کیجیے اور خود کو خلیفہ نامزد کر کے اپنے لیے بیعت لے لیجیے۔ آپ نے حضرت سعد بن ابی وقاص کے مشورے کا کوئی جواب نہ دیا اور حمد و ثنا کے بعد حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا: ''علی! میں نے لوگوں کی رائے لی ہے۔ وہ عثمان کے علاوہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے، اس لیے آپ اتفاق رائے کی خلاف ورزی کر کے ہدف ملامت نہیں بنیے گا۔''

یہ کہہ کر انھوں نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو مخاطب کیا اور فرمایا: ''عثمان! میں خدا و رسول اور ان کے بعد ابوبکر و عمر کے طریقے کے مطابق آپ کی بیعت کرتا ہوں۔''

ان کا یہ کہنا تھا کہ تمام لوگ بیعت کے لیے ٹوٹ پڑے۔ اول حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تیسرے خلیفہ راشد حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ ان کے بعد تمام مہاجرین و انصار اور وزرائے خلافت کے ہمراہ عام مسلمانوں نے بھی بیعت کی۔ [1]

خلیفۂ ثالث کے طور پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا انتخاب تمام مسلمانوں کا متفقہ فیصلہ تھا۔ صحابۂ کرام انھیں حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بعد امت کا افضل ترین فرد قرار دیتے تھے۔ یوں یہ امر نہایت فطری تھا کہ حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بعد ان کا انتخاب عمل میں آتا۔ خلیفۂ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں بھی تمام مسلمانوں کو یہی توقع تھی کہ آئندہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوں گے۔ کوفہ کے معروف تابعی حضرت حارثہ

[1] صحيح البخاري، حديث: 3700، وحديث: 7207.

بن مضرب رحمہ اللہ کی شہادت تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے۔ انھوں نے ایک مرتبہ بتایا تھا کہ میں نے عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں حج کیا۔ میں نے دیکھا کہ لوگ بڑے وثوق سے یہ کہتے تھے: اگلے خلیفہ عثمان رضی اللہ عنہ ہوں گے۔ [1]

انھی نے ایک اور موقع پر بتایا تھا کہ میں نے عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں حج کیا۔ ساربان دوران سفر میں یہ حدی گنگناتا تھا کہ عمر بن خطاب کے بعد عثمان بن عفان خلیفہ ہوں گے۔ [2]

خود حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی اس کے متعلق بے حد فکر مند تھے کہ ان کے بعد بار خلافت کون اٹھا پائے گا۔ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ مجھ سے دریافت فرمایا کہ آپ کے خیال میں لوگ میرے بعد کسے خلیفہ بنائیں گے۔ میں نے عرض کیا کہ لوگوں میں تو عثمان کا چرچا ہے۔ [3]

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ خلیفہ منتخب ہوئے تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کے حُسنِ انتخاب کو سراہتے ہوئے فرمایا: ''مسلمانوں نے آج اپنے بہترین فرد کو خلیفہ چنا ہے۔ انھوں نے خوب سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے۔'' [4]

امام شافعی رحمہ اللہ نے بھی حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے خلیفہ منتخب ہونے پر جامع تبصرہ کیا تھا۔ انھوں نے فرمایا تھا:

''حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت پر سب لوگوں کا اتفاق تھا۔ انھوں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو خلیفہ منتخب فرمایا تو سب لوگوں نے ان پر بھی اتفاق کیا۔

---

[1] مصنف ابن ابی شیبة: 588/14، حدیث: 38230. [2] فتح الباري: 244/13، بحواله فضائل الصحابة لخیثمة بسند صحیح . [3] فتح الباري: 244/13، بسند صحیح. [4] الطبقات لابن سعد: 63/3.

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے یہ معاملہ چھ اراکین شوریٰ کے سپرد کر دیا کہ وہ چھ میں سے کسی ایک کو خلیفہ بنا لیں، چنانچہ ان سب نے متفقہ طور پر حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو خلیفہ منتخب کیا۔''[1]

ان کے متفقہ انتخاب کے سلسلے میں حضرت امام احمد رحمہ اللہ کا یہ قول بھی نہایت قابل توجہ ہے: ''لوگ کسی کی بیعت پر اس قدر یک جہتی سے متفق نہیں ہوئے جس قدر یگانگی سے وہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی بیعت پر متفق ہوئے تھے۔''[2]

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے حضرت عبداللہ بن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما کی اس روایت پر جس میں یہ بیان ہوا ہے کہ صحابۂ کرام، حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو امت کا بہترین فرد سمجھتے تھے،[3] نہایت وقیع تبصرہ لکھا ہے۔ انھوں نے لکھا کہ اس روایت سے یہ بات آئینہ ہو جاتی ہے کہ صحابۂ کرام کے ہاں امت کے پہلے بہترین فرد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ دوسرے بہترین فرد حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور تیسرے بہترین فرد حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ تھے۔ بعض روایات میں تو یہ بھی آتا ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی صحابہ کرام کے اس نقطۂ نظر سے آگاہی حاصل تھی تاہم آپ نے کبھی ان کے اس نقطۂ نظر کی تردید نہیں فرمائی، جس کا صاف مطلب ہے کہ صحابۂ کرام کا یہ نقطۂ نظر بالکل درست تھا۔ اس کی مزید تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ خلیفۂ ثانی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد تمام مسلمانوں نے بھی بے چون و چرا حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی اور کسی فرد نے بھی ان کی بیعت سے روگردانی نہیں کی۔[4]

---

[1] مناقب الشافعي للبيهقي: 1/434. [2] منهاج السنة لابن تيمية: 3/166. [3] صحيح البخاري، حديث: 3698. [4] منهاج السنة لابن تيمية: 3/165.

ان روایات و اقوال سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ صحابۂ کرام کو خلیفۂ ثانی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ہی یقینی طور پر توقع تھی کہ اگلے خلیفہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہوں گے۔ انھی روایات و اقوال سے یہ بات بھی عیاں ہوتی ہے کہ تمام صحابۂ کرام نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو نہایت متفقہ طور پر تیسرا خلیفہ منتخب کیا تھا۔ حجاز کے علاوہ ملک کے اطراف و اکناف میں بسنے والے تمام لوگ بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ہی خلیفۂ ثالث دیکھنا چاہتے تھے۔

فتنۂ شہادتِ عثمان

حضرت امام زہری رحمہ اللہ کے بقول حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی مدت خلافت بارہ برس تھی۔ ابتدائی چھ برس کسی آدمی نے آپ پر کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ آپ قریش کے ہاں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے بھی زیادہ مقبول تھے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ان پر سختی کرتے تھے جبکہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے ان سے بے حد نرمی برتی۔ اس کے بعد فتنہ برپا ہوا۔[1]

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے دور خلافت میں اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی چھ برس میں مسلمان متحد تھے۔ ان کے بیچ کوئی تنازعہ نہیں تھا۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کے آخر میں ایسے حالات پیدا ہوئے کہ کئی طرح کے اختلافات نے جنم لیا تا آنکہ فتنہ پرور لوگوں کا ایک گروہ اٹھا اور انھوں نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو بہیمانہ طور پر شہید کر دیا۔ آپ کی شہادت کے بعد فتنوں کا دروازہ کھل گیا اور مسلمان ہمیشہ کے لیے فرقوں میں بٹ گئے۔“[2]

[1] الطبقات لابن سعد: 39/1. [2] مجموع الفتاوىٰ لابن تیمیة: 20/13.

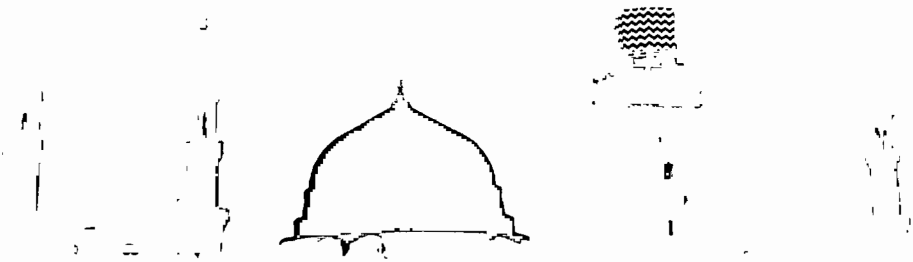
تمام مسلمان مؤرخین نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کے دوسرے نصف 30ھ سے 35ھ تک میں پیش آنے والے حالات و واقعات کو ''فتنوں'' کا عنوان دیا اور بتایا ہے کہ یہی فتنے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا باعث بنے۔[1]

خود خلیفۂ ثانی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی شہادت بھی فتنوں ہی کا پیش خیمہ تھی۔ اس کے بھیانک نتائج بعد ازاں خلافت عثمانی کے خوفناک فتنوں کی صورت میں سامنے آئے۔ خلیفۂ ثانی کی ذات بابرکات ان فتنوں کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ تھی۔ یہ بند ٹوٹا تو فتنوں کا سیلاب امڈتا چلا آیا۔ ذیل میں ان اسباب کا تفصیلی جائزہ لیا جاتا ہے جن کے نتیجے میں شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کا جانکاہ سانحہ پیش آیا تھا۔

---

[1] البداية والنهاية: 7/144.

فتنۂ شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ کا پہلا اور نہایت بنیادی سبب



فتنہ انگیزی کے سلسلے میں سبائیوں کا گھناؤنا کردار

نبیِ کریم ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے تو مدینہ کے جن افراد کو آپ کے مدینہ آنے پر بہت تشویش لاحق ہوئی ان میں یہود مدینہ سرفہرست تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کے سلسلے میں شدید دشمنی کا رویہ اپنایا اور جونہی وہ مدینہ آئے، یہودی ان کے خلاف سازشیں کرنے میں مصروف ہوگئے۔ وہ مسلمانوں کو ایذا پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ رسول اللہ ﷺ تو یہ چاہتے تھے کہ مدینہ کے باشندوں سے خوشگوار تعلقات قائم کیے جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے یہودیوں سے بھی معاہدہ کیا جس کے مطابق مشکل وقت آپڑنے پر مسلمانوں کو اور یہودیوں کو ایک دوسرے کا ساتھ دینا تھا۔ مسلمانان مدینہ اپنے وعدے پر ثابت قدمی سے قائم تھے کہ یہود مدینہ کی ایک خوفناک سازش سے پردہ اٹھا۔ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو شہید کر ڈالنے کی ناپاک منصوبہ بندی کر رکھی تھی۔ یہ ڈھٹائی اور دیدہ دلیری کی انتہا تھی۔ خود مسلمانوں کا پیمانۂ صبر بھی لبریز ہو چکا تھا، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے یہود کو جلا وطن کر کے خیبر کی طرف دھکیل دیا۔ [1]

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 3/191.

حیات مبارکہ کے آخری ایام میں آپ نے یہاں تک فرمایا تھا کہ میں یہود و نصاریٰ کو جزیرہ عرب سے نکال کر رہوں گا۔ میں یہاں مسلمانوں کے سوا کسی اور کو نہیں رہنے دوں گا۔''[1]

آپ نے وفات سے پہلے مسلمانوں کو یہ وصیت بھی فرمائی تھی کہ مشرکین کو جزیرۂ عرب سے نکال باہر کرنا۔''[2]

خیبر میں رہتے ہوئے بھی یہود کی گھناؤنی سرگرمیوں میں کوئی کمی نہ آئی۔ یثرب میں یہود کے دو بڑے قبیلے بستے تھے، بنونضیر اور بنوقریظہ۔ بنونضیر جلا وطن ہو کر خیبر چلے گئے تھے۔ انھوں نے بنوقریظہ کو بھی عہد شکنی پر آمادہ کیا اور دونوں قبائل نے مل کر مشرکین عرب کو مسلمانان مدینہ کے خلاف بھڑکایا۔ مشرکین عرب مدینہ پر چڑھ آئے۔ یوں غزوۂ خندق پیش آیا۔ غزوۂ خندق میں مشرکینِ عرب شکست فاش سے دو چار ہوئے۔ بعد ازاں مسلمانوں نے بنوقریظہ کو ان کی عہد شکنی کا مزہ چکھایا۔ خیبر میں بھی یہودیوں کا تعاقب کیا، ان کی خوب پٹائی کی اور انھیں جزیہ دینے پر مجبور کر دیا۔ حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے دور خلافت میں یہودیوں کی آواز پست رہی اور وہ موقع کی تلاش میں رہے۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کے دوسرے نصف میں بعض ناگزیر معاشرتی تبدیلیاں رونما ہوئیں (جن کے لانے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ہاتھ نہیں تھا) تو یہودیوں کو اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے فضا سازگار نظر آئی، چنانچہ وہ عبداللہ بن سبا کی صورت میں تاریخ کا نہایت پر اسرار اور گھناؤنا کردار منظر عام پر لائے۔ عبداللہ بن سبا یمن کے شہر صنعا کا یہودی باشندہ تھا۔ اس نے اسلام کا لبادہ اوڑھ

[1] صحيح مسلم، حديث: 1767. [2] صحيح البخاري، حديث: 3053.

کر اہل بیت کی محبت کا ڈھونگ رچایا اور خلیفۂ وقت حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے خلاف زہریلا پروپیگنڈہ کیا کہ انھوں نے خلافت پر غاصبانہ قبضہ کیا ہے۔ خلافت کے مستحق تو علی بن ابی طالب تھے۔ [1]

عبداللہ بن سبا یمن سے روانہ ہو کر سیدھا شام پہنچا تا کہ وہاں کے باشندوں کو بغاوت پر اکسائے اور انھیں اپنا ہمنوا بنائے۔ شام کے بیدار مغز حکمران حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ ایسے شر پسند عناصر پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ یوں ابن سبا شام میں اپنے شیطانی منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں ناکام رہا اور بصرہ آ گیا۔ بصرہ کے وزیر ان دنوں حضرت عبداللہ بن عامر بن کریز رضی اللہ عنہ تھے۔ وہ نہایت دانا، عادل اور نیک سیرت حکمران تھے۔

بصرہ میں ابن سبا وہاں کے بدقماش اور نہایت خطرناک چور حکیم بن جبلہ کے ہاں ٹھہرا۔ اس نے حکیم بن جبلہ کی بے راہ روی کا پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اسے اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے آلۂ کار بنا لیا۔ یوں ابن جبلہ بصرہ میں عبداللہ بن سبا کا ایجنٹ بن گیا اور اس کی ہدایات کے مطابق اپنے جیسے بے راہ رو افراد کو ابن سبا کا ہمنوا بنانے میں مصروف ہو گیا۔ ابن سبا اہل بصرہ کے بیمار دلوں میں اپنے گھناؤنے افکار کا بیج بوتا اور انھیں اپنی خفیہ تنظیم میں بھرتی کرتا رہا۔ اسی اثنا میں حضرت ابن کریز رضی اللہ عنہ کو اطلاع ملی کہ حکیم بن جبلہ کے ہاں ایک اجنبی ٹھہرا ہوا ہے۔ اس کی سرگرمیاں نہایت مشکوک ہیں۔ آپ نے ابن سبا کو طلب کیا اور اس کا اتہ پتہ پوچھا۔ ابن سبا نے جواب دیا کہ میں اہل کتاب تھا۔ اسلام میں دلچسپی ہوئی تو مسلمان ہو گیا۔ آپ کا پڑوس اچھا لگا تو یہاں

[1] تاريخ الطبري: 4/341.

آ کر رہنے لگا۔ حضرت ابن کریز رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تمھارے بارے میں جو باتیں پتہ چلی ہیں ان کا کیا جواب ہے تمھارے پاس! بہتر ہوگا کہ تم یہاں سے دفع ہو جاؤ۔''

ابن سبا بصرہ سے نکل گیا لیکن وہاں اپنے پیروکار چھوڑ گیا۔ یوں سبائی تحریک کی ایک شاخ وہاں بھی اپنا کام کرنے لگی۔ بصرہ سے نکل کر وہ کوفہ چلا گیا۔ کوفیوں کی باغیانہ خو زبان زد عام تھی۔ بغاوت کی تحریک اٹھانے میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ وہ تو ایسے آدمی کے انتظار میں رہتے تھے جو انھیں انحراف کی راہ دکھائے۔ ان کی بڑی تعداد ابن سبا کے گمراہ کن افکار و نظریات سے متأثر ہوئی اور اس کی ہمنوا بن گئی۔ کوفہ کے وزیر حضرت سعید بن عاص رضی اللہ عنہ کو ابن سبا کی حرکتوں کا پتہ چلا تو آپ نے اسے کوفہ سے نکال دیا۔ اب اس نے فسطاط (مصر) کا رخ کیا۔ وہاں اُس نے خوب بال و پر نکالے۔

کم عقل، نافرمان اور جرائم پیشہ افراد کو اپنے ساتھ ملایا اور انھیں اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال کیا۔ مصر ہی کو اس نے اپنی ہلاکت خیز سرگرمیوں کا مرکز قرار دیا اور مدینہ منورہ، کوفہ و بصرہ اور دیگر بڑے شہروں میں مقیم اپنے پیروکاروں سے خفیہ رابطہ رکھا۔ اس کی خفیہ تنظیم کے کارکنان اِن شہروں میں برابر متحرک رہے۔ [1]

سبائیوں کا طریقۂ واردات یہ تھا کہ وہ تقویٰ کا لبادہ اوڑھ کر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے بہانے خلیفہ وقت کے متعلق ہرزہ سرائی کرتے، ان پر جھوٹے الزامات عائد کرتے اور لوگوں کو ورغلاتے کہ آگے بڑھ کر خلیفہ کا تختہ الٹ دو۔'' [2]

انھوں نے بالخصوص اہل کوفہ کو اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال کیا۔ انھیں اس امر پر آمادہ کیا کہ وہ وزیر خلافت کے خلاف بغاوت کر دیں۔ سبائیوں کی شہ

---

[1] الخلفاء الراشدون للخالدی، ص: 129. [2] تاريخ الطبري: 348/5.

پا کر مختلف علاقوں کے لوگ وزرائے خلافت کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر اعتراض کرنے لگے۔ صحرائے عرب میں بسنے والے سادہ لوح بدوؤں کو بھی انھوں نے اپنی سازش کے جال میں پھنسایا۔ ان کے قاریوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا جھانسا دے کر اپنا گرویدہ بنا لیا۔ نیز حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر گھناؤنے الزامات عائد کیے اور شر پسندوں کو ان کے خلاف بھڑکایا۔ انھوں نے کہا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے عزیز و اقارب کی بے جا طرف داری کرتے اور انھیں سرکاری بیت المال سے نوازتے ہیں۔ یہ بہت گھٹیا الزام تھا۔ امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے چھبیس وزرا میں سے صرف پانچ نہایت باصلاحیت اور لائق وزرا ان کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ وہ افراد تھے جنھیں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نے بھی مستقل طور پر یا گاہے گاہے وزیر بنایا تھا۔ ان پانچ میں سے بھی دو وزرا کو بعد ازاں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے برطرف کر دیا۔ جہاں تک انھیں بیت المال سے نوازنے کا تعلق ہے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خود بے حد دولت مند اور بڑے دریا دِل تھے۔ بیت المال کے روپیہ کی انھیں قطعی ضرورت نہیں تھی۔ اپنے روپیہ سے انھوں نے اپنے عزیز اقارب کو بہت نوازا تھا جس کا اعتراف وہ خود بھی کرتے تھے۔

ابن سبا نے دوسرا حربہ یہ اختیار کیا کہ اس نے اپنے ہمنواؤں سے کہا وہ مختلف شہروں میں ایک دوسرے کو خطوط لکھیں جن میں وہ اپنے شہر کے حالات نہایت گھمبیر بیان کریں تاکہ تمام شہروں کے باشندے یہ سمجھیں کہ پورا ملک سیاسی عدم استحکام کا شکار ہے۔ اور خلیفہ کو اب مزید مہلت دینے کی کوئی گنجائش نہیں۔ انھوں نے اکابر صحابہ کے نام سے کئی خطوط گھڑے اور ملک کے مختلف شہروں میں روانہ کر دیے۔

ان شہروں میں وہ خطوط جن لوگوں کو موصول ہوئے وہ بھی ابن سبا کے کارندے تھے۔ انھوں نے عوام کو وہ خطوط دکھائے اور کہا کہ دیکھو، یہ خط حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہے۔ یہ خط حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ نے بھیجا ہے۔ یہ خط حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے آیا ہے اور یہ خط ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے لکھا ہے۔ یہ اکابر صحابہ کے خطوط ہیں۔ یہ سب کے سب خلیفہ عثمان بن عفان سے نجات پانا چاہتے ہیں۔ وہ خطوط دیکھ کر لوگوں میں مزید اضطراب پھیلا اور وہ پوری طرح بغاوت کرنے پر آمادہ ہوگئے۔ اس سلسلے کا آخری خط انھوں نے امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نام سے گھڑا جس نے باغیوں کو بالکل بے قابو کردیا تھا۔ یوں بنیادی طور پر شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کا فتنہ سبائیوں نے اٹھایا تھا۔ دیگر تمام اسباب ثانوی نوعیت کے حامل تھے۔

فتنۂ شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ کا دوسرا سبب

فتنہ انگیزی کے سلسلے میں بدوؤں کا کردار

فتنہ انگیزی کے سلسلے میں ان بدوؤں نے بھی نہایت گھناؤنا کردار ادا کیا تھا جن کے دلوں میں ایمان نے گھر نہیں کیا تھا۔ ان کا تعلق مضر، ربیعہ اور یمن کے مختلف قبائل سے تھا جو بادیہ میں آباد تھے اور لڑائیاں کرنا ان کی زندگی کا واحد مقصد تھا۔ اسی بدمزاجی اور تند خوئی کے ہمراہ یہ لوگ اسلام کے دائرے میں آئے تھے۔

قبول اسلام کے بعد بدو تین اصناف میں بٹ گئے تھے۔ ایک صنف تو وہ تھی جس کے اسلام میں بے حد خوبی آئی اور ایمان نے حقیقی معنوں میں اس کے دل میں گھر کیا۔ دوسری صنف ان بدوؤں پر مشتمل تھی جو مسلمانوں کے ڈر سے یا مال غنیمت کے لالچ میں اسلام لائے تھے۔ ایسے بدو منافق تھے۔ تیسری صنف میں وہ بدو شامل تھے جو انتہا پسندی کی حد تک عبادت گزار اور تارک دنیا تھے۔ دین کے معاملات میں ہٹ دھرمی اور شدت پسندی ان کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ یہ متشدد افراد قرآنی آیات اور احادیث نبوی کی اس تاویل وتشریح پر یقین رکھتے تھے جو ان کے سخت مزاج سے ہم آہنگ ہوتی تھی۔ دینی احکامات کا نہایت سطحی فہم رکھنے والے نہایت جذباتی لوگ تھے



منطقی استدلال اور مختلف معاملات کا تجزیہ کرکے درست نتیجے پر پہنچنے کی صلاحیت ان لوگوں میں نہیں تھی۔ یہی وہ قاری تھے جنھوں نے آگے چل کر خوارج کا روپ دھارا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کے ابتدائی ایام میں جب فتوحات کا دائرہ بہت پھیل گیا تو فوج کو افرادی قوت کی ضرورت پڑی، چنانچہ بہت سے بدو فوج میں بھرتی کرلیے گئے۔ فوج میں شامل ہونے سے ان کے رعب و دبدبہ میں یکدم بہت اضافہ ہوگیا۔ خلافت عثمانی کے آخری دور میں فتوحات کا سلسلہ منقطع ہوا تو بدوؤں کو فارغ البالی میسر آئی۔ اب چونکہ ایمان ان کے دل میں جاگزیں نہیں تھا اور وہ مال غنیمت کے لالچ میں مسلمان ہوئے تھے، اس لیے وہ امور سیاست اور امور مالیات میں دلچسپی لینے اور ان میں کیڑے نکالنے لگے۔ خلیفۂ وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس حدیث کے پیش نظر کہ جو آدمی بنجر زمین کو آباد کرے گا اس کے مالکانہ حقوق بھی اسی کو ملیں گے، [1] مفتوحہ اراضی میں سے کچھ بنجر زمین کے مالکانہ حقوق بعض کبار صحابۂ کرام کو عطا کیے۔ اس پر سبائیوں نے بہت شور مچایا۔ بدو جو تمام مفتوحہ اراضی کو باپ کی جاگیر سمجھتے تھے، انھیں بھی بہت غصہ آیا۔ انھوں نے بھی سبائیوں کے پروپیگنڈے کو آگے بڑھاتے ہوئے خوب شور مچایا۔ ہر چند جنابِ خلیفہ نے انھیں بھی بڑی بڑی جاگیریں عطا کی تھیں، ان کی جہالت، ہٹ دھرمی اور کینہ پروری نے انھیں خلیفہ کا جانی دشمن بنا دیا۔

سبائیوں کا پروپیگنڈہ جلتی پر تیل کا کام کرتا رہا۔ بدوؤں کی عقل کا جنازہ نکل چکا تھا۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ خلیفہ غلطی پر ہے اور وہ اس کی اصلاح کرنے نکلے ہیں، چنانچہ یہ نام نہاد مصلحین فتنہ انگیزی کے سلسلے میں سبائیوں کا سب سے کارآمد ہتھیار ثابت ہوئے۔

[1] جامع الترمذي، حديث: 1379.

ان کے ہوتے ہوئے سبائیوں کو بہت کم محنت کرنی پڑی۔ خلیفۂ وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی نرمی اور رحم دلی کے باعث بگڑے ہوئے بدو قبائل میں سکون، نخع اور عبدہ کے وہ قبائل بھی شامل تھے جنھوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ارتداد کی راہ اختیار کی تھی۔ انھی نے دارالخلافہ کا محاصرہ کیا تھا۔ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کے نمایاں سرغنوں سودان بن حمران، مالک بن حارث، اشتر نخعی اور حکیم بن جبلہ کا تعلق انھی قبائل سے تھا۔[1]

[1] تاريخ الطبري:3/334، والبداية والنهاية:6/352.

فتنۂ شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ کا تیسرا سبب

معاشرتی تبدیلیاں

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں اسلامی معاشرے نے حیرت انگیز ترقی کی تھی۔ وہ جب بر سر اقتدار آئے تو وہ محدود حکومت جو مدینہ منورہ میں قائم ہوئی تھی، ترقی کر کے جزیرہ نمائے عرب کی عالمی ریاست میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اس کی سرحدیں عراق، شام، مصر، افریقہ، ایران اور بحیرۂ روم کے جزائر تک پھیلی ہوئی تھیں۔ [1]

ریاست اور اس کے باشندوں کے مزاج میں آنے والی اس تبدیلی کے نتیجے میں مسلمانوں کی نئی نسل نے جنم لیا۔ نئی نسل کے جذبات و احساسات پرانی نسل سے مختلف تھے۔ پرانی نسل جس نے ریاست کی بنیادیں استوار کی تھیں، نئی نسل کے مقابلے میں ایمان و یقین کے لحاظ سے برتر تھی۔ اس کی سوچ صحیح اسلامی عقیدے اور قرآن و سنت کے محکم اصولوں پر مبنی تھی۔ اس نے جذبات و احساسات کے منہ زور گھوڑے کو اسلام کی لگام ڈال رکھی تھی۔ یہ خوبیاں اس نئی نسل میں پیدا نہیں ہو پائی تھیں جو وسیع تر فتوحات کے نتیجے میں ظہور میں آئی تھی۔ صحابۂ کرام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں

[1] تاریخ خلیفة بن خیاط، ص: 157-167.

جس طرح صحیح اسلامی عقیدے کے مطابق تربیت پائی تھی، فتوحات کی پروردہ نئی نسل اس کی فیض رسانیوں سے محروم رہی تھی۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ ایک تو نئی نسل کی تعداد بہت زیادہ تھی، دوسرے، فاتحین نئی نئی مہمات سر کرنے میں مصروف تھے۔ یوں وہ نئی نسل پر توجہ نہیں دے پا رہے تھے، چنانچہ نئی نسل کے افراد ایک طرف تو سنی سنائی باتوں سے جلد متأثر ہو جاتے، دوسری طرف وہ ان افکار و نظریات اور اُن روایات واقدار کا چرچا کرتے نظر آتے جو انھیں جاہلی ذرائع سے معلوم ہوئی تھیں۔

عمال حکومت کے نام ایک خط میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بڑھتی ہوئی معاشرتی تبدیلی کا ذکر کیا تھا۔ آپ نے اس تبدیلی کے اسباب بھی بیان کیے تھے۔ آپ نے لکھا تھا: رعایا کی تعداد میں بے پناہ اضافہ ہو گیا ہے اور وہ شر کی طرف دوڑی چلی آتی ہے۔ تین باتیں اسے اس طرف دھکیل رہی ہیں: مال و متاعِ دنیا جسے ہر شے پر ترجیح دے دی گئی ہے۔ خواہشات نفس جن کی پیروی عام طور پر کی جاتی ہے۔ اور سخت کینہ جسے لوگ سینوں میں اٹھائے پھرتے ہیں۔''[1]

کوفہ کے وزیر حضرت سعید بن عاص رضی اللہ عنہ نے خلیفہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں خط لکھا تھا جس میں انھوں نے کوفہ کے روز افزوں معاشرتی تغیرات کا تذکرہ کھلے الفاظ میں کیا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا: ''اہل کوفہ کی سیاسی و معاشرتی صورتحال عدم توازن سے دو چار ہے۔ نچلے طبقے کے افراد اور باہر سے آنے والے گھٹیا بدو شہر کے معزز افراد پر غلبہ پا رہے ہیں اور طوطی آج کل انھی کا بولتا ہے۔ معزز افراد کو تو کوئی پوچھتا نہیں۔''[2]

مفتوحہ علاقوں میں مختلف قبائل کے اجتماع نے بھی عجیب وغریب مخلوط معاشرہ جنم دیا تھا۔ اس معاشرے کی اپنی ہی خصوصیات اور اپنے ہی طور اطوار تھے۔

---

[1] تاریخ دمشق لابن عساکر، ص: 240. [2] تاریخ الطبري: 4/279.

اگرچہ اسلام نے ان مختلف قبائل کو اپنے سانچے میں ڈھال لیا تھا تاہم یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ صحابۂ کرام کی طرح انھوں نے مناسب تربیت نہیں پائی تھی۔ نیز یہ لوگ اسلام کے اصلی جوہر سے بھی بڑی حد تک ناواقف تھے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ جس تیزی سے فتوحات ہو رہی تھیں، اس لحاظ سے مفتوح اقوام کی اسلامی تربیت کا انتظام نہیں ہو پایا تھا۔ یوں اسلامی معاشرے کا فکری توازن بگڑ گیا تھا جس کے منفی اثرات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کے آخری ایام میں سامنے آئے۔

خوشحالی اور عہد عثمانی کے اسلامی معاشرے پر اس کے مثبت و منفی اثرات

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں فتوحات کا دائرہ بے حد وسیع ہوا جس کے باعث مال و دولت کی ایسی فراوانی ہوئی کہ کہیں دیکھی نہ سنی۔ مسلمانوں پر ہن برسنے لگا۔ ان کی آسودہ حالی کا آنکھوں دیکھا حال حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ مجھے معلوم ہے لوگوں نے عثمان رضی اللہ عنہ کو کیوں ناپسند کرنا شروع کیا۔ دراصل کم ہی ایسا دن آتا کہ لوگوں میں مال و دولت تقسیم نہ ہوتا۔ اکثر اوقات منادی کرائی جاتی کہ مسلمانو! اپنے عطیات وصول کر لو۔ لوگ آتے اور وافر مقدار میں عطیات پاتے۔ کبھی اعلان کیا جاتا کہ آؤ بھائی! گھی اور شہد لے لو۔ یوں عطیات کا سلسلہ جاری رہتا۔ وظائف ملتے رہتے۔ دشمن خوف زدہ تھا۔ مسلمانوں کے باہمی تعلقات بہت اچھے تھے۔ ہر طرف برکتیں ہی برکتیں تھیں۔ دوسری طرف اہل اسلام کے خلاف تلوار ابھی میان میں تھی۔ بعد ازاں انھوں نے وہ تلوار خود پر سونت لی۔ بخدا! تب سے اب تک وہ تلوار مسلمانوں کی گردنیں کاٹ رہی ہے۔ مجھے تو بخدا یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ تلوار قیامت تک بے نیام ہی رہے گی۔[1]

[1] البداية والنهاية: 224/7.

یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ مال و دولت کی فراوانی اپنا رنگ نہ جماتی۔ خاص کر وہ افراد جو نئے نئے مسلمان ہوئے تھے اور جن کے دلوں میں ایمان نے گھر نہیں کیا تھا، اس صورتحال سے بے حد متأثر ہوئے۔ وہ پیسے کی دوڑ میں شامل ہو گئے۔ مارے حسد کے ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگے۔ یہی لوگ سب سے زیادہ فتنوں کا شکار ہوئے۔ ان میں وہ بگڑے ہوئے رئیس زادے بھی شامل تھے جنھیں خلیفۂ وقت نے من مانیاں کرنے سے روکا تو وہ ان کی جان کے دشمن بنے اور فتنہ پرور گروہ میں شامل ہو گئے۔

ایسے حالات میں جبکہ دولت کی فراوانی تھی اور لوگ مختلف علاقوں کو فتح کرنے کے بعد فارغ ہو کر اطمینان سے بیٹھ گئے تھے، لوگوں کو خلیفۂ وقت میں کیڑے نظر آنے لگے اور انھوں نے حکومتی اقدامات پر بے جا تنقید کرنی شروع کر دی۔ یوں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا وہ فرمان بھی سمجھ میں آجاتا ہے جو آپ نے در بند کے وزیر حضرت عبدالرحمٰن بن ربیعہ باہلی رضی اللہ عنہ کو لکھ بھیجا تھا: ''رعایا میں سے بہت سے افراد کو مال و دولت کی فراوانی نے مغرور بنا دیا ہے، لہٰذا ان کے وظائف میں کمی کر دو اور مسلمانوں کو خطرے میں نہ ڈالو۔ خدشہ ہے کہ وہ آزمائش میں پڑ جائیں گے۔''[1]

ایک اور موقع پر آپ نے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا: ''خبردار! یہ دنیا فانی ہے۔ یہ تمھیں غرور میں مبتلا نہ کرے۔ یہ تمھیں فکر آخرت سے غافل نہ کرے۔ زمانے کے حوادث سے بچو۔ جماعت سے وابستہ رہو۔ فرقوں اور تنظیموں میں مت بٹو۔''[2]

[1] تاریخ الطبري:4/304. [2] تاریخ الطبري:4/384.

فتنۂ شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ کا پانچواں سبب

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی نرم مزاجی اور رحم دلی

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نہایت حلیم الطبع، بردبار، متحمل مزاج اور صبر مند آدمی تھے۔ تحریک فتنہ اٹھانے والوں نے آپ کی نرم مزاجی کا بھی ناجائز فائدہ اٹھایا تھا۔ ایک دفعہ آپ نے چند جرائم پیشہ افراد سے فرمایا تھا جنھیں آپ کے حکم سے جیل میں ڈالا گیا تھا:

''کیا تمھیں معلوم ہے کہ تمھیں جرائم کی جرأت کس نے دلائی ہے؟! تمھیں میری نرمی نے جرائم کی جرأت دلائی ہے۔''[1]

جب خارجیوں کے جارحانہ عزائم منظر عام پر آئے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے صحابۂ کرام کی موجودگی میں ان کے الزامات کا جواب دیا اور انھیں دلیل دینے کا پابند کیا۔ مسلمان بلوائیوں سے لڑائی کرنے پر مصر تھے مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی فطری نرم مزاجی آڑے آتی تھی۔ آپ کا اصرار تھا کہ نہیں! ہم درگزر کریں گے اور ہر ممکن طریقے سے انھیں سمجھائیں گے۔ کسی سے اس وقت تک جنگ نہیں کریں گے جب تک وہ واضح طور پر کفر کا یا ایسے گناہ کا ارتکاب نہیں کرتا جس کے نتیجے میں اُس پر حد قائم کرنی لازم ٹھہرے۔''[2]

[1] المعارف لابن قتيبة: 83. [2] تاريخ الطبري: 4/346.

یوں خلیفۂ ثانی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں خلیفۂ ثالث حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا طرز حکومت بردباری اور متحمل مزاجی پر مبنی تھا۔ تاہم خیر کا عنصر دونوں حکومتوں میں بدرجۂ اتم پایا جاتا تھا۔

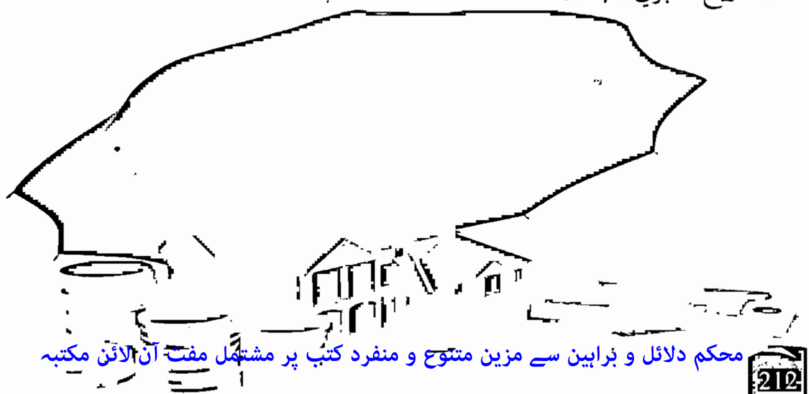
فتنۂ شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ کا چھٹا سبب

کبار صحابۂ کرام کو مدینہ منورہ سے نقل مکانی کی اجازت

خلیفۂ ثانی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کبار صحابۂ کرام پر یہ پابندی عائد کر رکھی تھی کہ وہ مستقل طور پر مدینہ منورہ کے باہر کسی اور شہر منتقل نہیں ہو سکتے، چنانچہ قریش کا کوئی بڑا صحابی کہیں جانا چاہتا تو وہ امیر المومنین سے باقاعدہ اجازت لیتا اور دوسرے شہر میں قیام کی مدت سے بھی آگاہ کرتا۔ [1]

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو دراصل یہ خدشہ تھا کہ یہ حضرات مختلف اضلاع اور علاقوں میں پھیل جائیں گے۔ ان کے پاس مال و متاع اور جائیداد کی فراوانی ہو جائے گی۔ یوں یہ لوگ دنیا کے فتنوں میں پڑ جائیں گے۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ برسرِ اقتدار آئے تو انھوں نے یہ پابندی اٹھا دی، چنانچہ قریش سے تعلق رکھنے والے کئی صحابۂ کرام نے مختلف شہروں میں جائیدادیں بنا لیں اور وہیں رہنے لگے۔ لوگ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہونے کی وجہ سے ان کے گرویدہ ہو گئے۔ نتیجتاً بہت سے ایسے افراد بھی ان صحابۂ کرام سے وابستہ ہو گئے، جن کی معاشرے میں کوئی حیثیت نہ تھی، نہ انھوں نے

[1] تاريخ الطبري: 4/396.



اسلام کے لیے کوئی کارنامہ انجام دیا تھا۔ یوں ان میں بھی احساس برتری پیدا ہو گیا۔ یہ صحابۂ کرام جہاں جہاں قیام فرما تھے، ان علاقوں کے لوگ گروہوں کی شکل اختیار کر گئے۔ ہر علاقے کے لوگ یہی چاہتے تھے کہ جو صحابی ان کے ہاں قیام فرما ہیں، وہی خلیفہ بنیں۔ [1]

[1] تاریخ الطبري:4/398.

فتنۂ شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ کا ساتواں سبب

قریش کی حکومت سے بعض عرب قبائل کا حسد

مفتوحہ علاقوں کے ناتربیت یافتہ افراد میں قبائلی تعصب پھوٹ پڑا تھا۔ انھیں قریش کی حکومت ناگوار گزرنے لگی تھی۔ قریش کے خلاف تعصب ان قبائل میں زیادہ تھا جو نسبتاً تاخیر سے اسلام لائے تھے۔ ان میں بنوبکر بن وائل اور عبدالقیس کے بعض افراد، ربیعہ، ازد، کندہ، تمیم، قضاعہ، نخع اور سکون کے قبائل سرفہرست تھے۔ اس فتنے کی اولین چنگاریاں کوفے کی خاکستر میں پیدا ہوئی تھیں۔ ایک واقعہ اس نکتے کی وضاحت کے لیے کافی ہے۔ کوفہ کے وزیر حضرت سعید بن عاص رضی اللہ عنہ ایک روز لوگوں کی شکایات سننے بیٹھے تھے۔ اتنے میں چند لوگ حاضر خدمت ہوئے جن میں اشتر نخعی، صعصعہ بن عبدی، خنیس بن حبیش [1]، اس کا بیٹا عبدالرحمٰن بن خنیس اور چند دیگر افراد شامل تھے۔ باتوں باتوں میں خُنیس بن حُبیش نے کہا کہ طلحہ بن عبیداللہ کتنے دریا دل آدمی ہیں! اس پر حضرت سعید بن عاص رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جس کے پاس نشاستج کے جیسی زرخیز اراضی ہو اسے دریا دل ہونا ہی چاہیے۔ اگر میرے پاس بھی ویسی اراضی ہوتی تو میں تم لوگوں کو آسودہ حال کر دیتا۔

[1] خنیس بن حبیش اسدی، خلیفۂ ثالث حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی طرف سے عراق کے ایک شہر ماس بذان کے وزیر رہ چکے تھے۔

عبدالرحمٰن بن خُنیس جو ابھی بچہ تھا، بیچارا بول پڑا:

''واللہ! یا امیر! میری تو تمنا ہے کہ ساحل آپ کے ہو جائیں۔''

اس کی یہ بات سن کر اشتر تو تڑپ اٹھا۔ بولا: ''اللہ کرکے تیرے دانت ٹوٹیں۔ واللہ! ہم تجھی کو سبق سکھانے تو یہاں آئے ہیں۔''

عبدالرحمٰن کے والد خنیس نے بہتیرا کہا: چھوڑیے جانے دیجیے۔ بچہ ہے، ناسمجھ ہے۔ لیکن اشتر اور اس کے ساتھی تو ان باپ بیٹے کے سر ہوئے۔ خنیس سے کہنے لگے: ''فرات کے ساحل تو ہمارے ہیں۔ یہ کون ہوتا ہے ابن عاص کے لیے ان کی تمنا کرنے والا۔ معلوم ہوتا ہے تو نے ہی اسے یہ سبق سکھایا تھا۔''

یہ کہہ کر وہ عبدالرحمٰن پر پل پڑے۔ خنیس آڑے آیا تو انھوں نے دونوں باپ بیٹے کو خوب زد و کوب کیا اور مار مار کر بے ہوش کر دیا۔ حضرت سعید بن عاص رضی اللہ عنہ انھیں خدا کے واسطے دیتے رہے لیکن ان بدمعاشوں نے ایک نہ سنی۔ تمام اہل کوفہ نے اس افسوسناک واقعے پر تاسف کا اظہار کیا۔ خنیس کے اہل قبیلہ بنواسد تو بہت دل برداشتہ ہوئے۔ کوفہ کے عمائدین و صلحا نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں درخواست دائر کی کہ ان بدمعاشوں کو شہر بدر کریے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جواباً تحریر فرمایا کہ اشراف کوفہ ان کے نکالنے پر متفق ہیں تو انھیں معاویہ کے ہاں بھیج دیجیے۔ اور معاویہ کو لکھا کہ اہل کوفہ نے چند ایسے افراد کو شہر بدر کرکے تمھارے ہاں بھیجا ہے جو فتنہ انگیزی کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ انھیں تھوڑی ڈانٹ بتاؤ اور ان پر کڑی نظر رکھو۔ راہ راست پر آجائیں تو ٹھیک ورنہ ان کو واپس کوفہ ہی بھیج دو۔ [65]

---

[65] تاريخ الطبري: 4/317.

یہ 33ھ کا واقعہ ہے۔ اس واقعے سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں فتنے کی آگ سب سے پہلے کوفہ میں بھڑکی تھی اور بقول امام عامر شعبی رحمہ اللہ کوفہ ہی وہ پہلا شہر ہے جس کے باشندوں کو شیطان نے اپنے پیچھے لگایا اور ایک دوسرے کے خلاف بھڑکایا تھا۔ [1]

[1] تاریخ الطبري: 4/251.

شہادت عثمان رضی اللہ عنہ

جن شر پسند عناصر کو کوفہ سے شہر بدر کر کے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاں شام بھیجا گیا تھا، ان میں اشتر نخعی، جندب ازدی، صعصعہ بن صوحان، کمیل بن زیاد، عمیر بن ضابی اور ابن کوا شامل تھے۔ یہ افراد شام پہنچے تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کا خیر مقدم کیا۔ ان کے لیے بہترین قیام گاہ کا بندو بست کیا۔ خوب کھلایا پلایا اور پیار کی زبان سے سمجھایا کہ شرارتوں سے باز آ جاؤ۔ تمھارے حق میں یہی بہتر ہے۔ وہ لاتوں کے بھوت تھے۔ باتوں سے کیونکر ٹلتے۔ انھوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی شان میں گستاخی کی اور نہایت بدتمیزی سے پیش آئے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ چاہتے تو ان کے تمام پیچ وخم نکال دیتے تاہم آپ نے بے حد تحمل اور بردباری کا مظاہرہ کیا۔ امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ آپ نے جن افراد کو میرے ہاں بھیجا ہے وہ شیطان کی زبان بولتے اور اسی کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔ انھوں نے اپنے علاقے کے بہت سے لوگوں کو خراب کیا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ میرے علاقے کے لوگوں کو خراب کریں، آپ انھیں واپس بھجوا دیجیے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے والی کوفہ حضرت سعید بن عاص رضی اللہ عنہ کو لکھا تو انھوں نے ان شر پسندوں کو واپس بلوا لیا لیکن التجا کی کہ خود وہ بھی ان کے ہاتھوں عاجز آ گئے ہیں۔ خلیفۂ ثالث

نے انھیں لکھا کہ ان بدقماشوں کو عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید کے ہاں حمص روانہ کردو۔ وہ انھیں خوب سمجھے گا۔‘‘[1]

حضرت عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے فتنہ پردازوں کو آڑے ہاتھوں لیا اور ان کی اچھی خاصی درگت بنا ڈالی۔ شرپسندوں کو عافیت اسی میں معلوم ہوئی کہ فی الوقت ان سے معافی چاہیں اور توبہ کا اقرار کرلیں۔ انھوں نے حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کے آگے ہاتھ جوڑے کہ خدا کے لیے ہمیں معاف کر دیجیے۔ ہم شرارتوں سے باز آئے۔ حضرت ابنِ خالد رضی اللہ عنہ نے ان کے سرغنہ اشتر نخعی کو جناب خلیفہ کی خدمت میں بھیجا کہ جا کر ان سے معافی چاہو۔ ان کے رو برو توبہ کا اقرار کرو اور آئندہ شرارتوں سے باز آنے کا وعدہ کرو۔ اشتر نے جناب خلیفہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر معافی چاہی تو آپ نے اسے اور اُس کے چیلوں کو معاف کر دیا اور فرمایا کہ تم آزاد ہو، جہاں جی چاہے جا کر رہو۔ یہ 33 ھ کی بات ہے۔ کوفے کے فتنہ پردازوں نے اپنے سرداروں کی حجامت بنتے دیکھی تو انھوں نے بھی کچھ عرصہ کے لیے چپ سادھ لی۔[2]

ادھر بصرہ کے فتنہ پرداز، سبائیوں کے سرغنہ حکیم بن جبلہ کے زیر قیادت بصرہ کے اصحاب فضیلت کو تنگ کرنے اور ان پر بہتان لگانے میں مصروف تھے۔ 34 ھ میں ابن سبا نے تحریک فتنہ کو از سر نو منظّم کیا اور ملک کے مختلف حصوں میں سرگرم عمل اپنے گماشتوں کو پیغام بھیجا کہ بغاوت کا وقت آن پہنچا۔ اشتر نخعی کے الجزیرہ چلے جانے کے بعد فتنہ پردازان کوفہ کی قیادت یزید بن قیس کے ہاتھ میں تھی۔ کوفے کے سرکردہ افراد جہاد پر چلے گئے تو یزید بن قیس نے کوفے کے اوباشوں کو ساتھ ملایا اور اعلان

[1] تاريخ الطبري: 331/5. [2] تاريخ الطبري: 327/5.

بغاوت کر دیا۔ حضرت قعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہ کو ان کے اعلان بغاوت کی خبر ملی تو آپ نے ان کا گھیراؤ کر کے ان کے سرغنہ یزید بن قیس کو گرفتار کر لیا۔ حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ نے یزید کو خوب لتاڑا تو اس نے یہ کہہ کر معذرت چاہی کہ ہمارا مقصد خلیفۂ وقت کے خلاف بغاوت کرنا نہیں، ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ سعید بن عاص کو معزول کر کے کسی اور کو حاکم کوفہ بنایا جائے۔ حضرت قعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہ نے اس کی معذرت قبول کی اور اسے آزاد کر دیا تاہم یہ تاکید کی کہ مسجد میں اکٹھ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمھیں جو بھی مسئلہ ہے، امیر المومنین کی خدمت میں پیش کرو۔ [112]

یزید بن قیس گھر میں بیٹھ کر منصوبے بنانے لگا کہ فتنہ کیوں کر برپا کرنا چاہیے۔ اس نے ایک آدمی کے ہاتھ ان سبائیوں کو خفیہ پیغام بھیجا جنھیں کوفہ سے نکال دیا گیا تھا اور اب وہ حضرت عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ہاں الجزیرہ میں مقیم تھے۔ اس نے انھیں لکھا کہ جونہی میرا خط ملے، کوفہ چلے آؤ۔ اور بتایا کہ ہم نے مصر میں موجود اپنے بھائیوں (سبائیوں) سے خط کتابت کی ہے اور اب ہم بغاوت کی تیاریاں کر رہے ہیں اشتر نخعی اور اس کے ساتھی حضرت عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی آنکھ بچا کر کھسک گئے اور سیدھے کوفہ آن اترے۔ تمام سبائی اور ان کے ہم نوا مسجد میں اکٹھے ہوئے۔ اشتر نخعی نے لوگوں کو بغاوت پر اکسایا اور جھوٹ بولا کہ میں امیر المومنین عثمان کے ہاں سے آیا ہوں۔ تمھارے حاکم سعید بن عاص بھی ان کی خدمت میں موجود تھے۔ وہ دونوں اس امر پر متفق ہو چکے ہیں کہ تمھارے وظائف میں کمی کر دی جائے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عاص رضی اللہ عنہ کے درمیان سرے سے ایسی بات

[112] تاريخ الطبري:5/337.

چیت نہیں ہوئی تھی۔ عوام کو بھڑکانے کے لیے یہ سبائیوں کی ایک چال تھی۔ مسجد میں شور برپا ہوگیا۔ ادھر یزید بن قیس نے اعلان کیا کہ میں سعید بن عاص کو کوفے میں داخل نہیں ہونے دوں گا۔ حضرت سعید بن عاص رضی اللہ عنہ بعض سرکاری معاملات کے سلسلے میں مشاورت کے لیے امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں مدینہ منورہ گئے ہوئے تھے۔ کوفے میں وہ حضرت عمرو بن حریث کو اپنا نائب مقرر کر گئے تھے۔ سبائیوں اور کوفے کے بیوقوفوں نے یزید بن قیس کی ہاں میں ہاں ملائی اور ایک ہزار کے قریب افراد حضرت سعید بن عاص رضی اللہ عنہ کا راستہ روکنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ [1]

حضرت ابن عاص رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ سے روانہ ہو کر کوفے کے قریب پہنچے تو سبائیوں نے جو ان کا راستہ روکے کھڑے تھے، ان سے کہا کہ ہمیں آپ کی ضرورت نہیں۔ آپ واپس چلے جائیے۔ ہم آپ کو کوفے میں نہیں آنے دیں گے۔ جائیے، جا کر خلیفہ سے کہہ دیجیے کہ ابوموسیٰ اشعری کو کوفے کا والی بنائیں۔ حضرت سعید بن عاص رضی اللہ عنہ نے نہایت ہوش مندی سے کام لیا اور چوں چرا کیے بغیر واپس چل دیے۔ مدینہ منورہ پہنچ کر امیر المومنین کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھیں باغیوں کے تازہ ترین حالات سے آگاہ کیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دریافت فرمایا کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ کیا وہ خلیفۂ وقت کے خلاف بغاوت پر اتر آئے ہیں۔ حضرت سعید بن عاص رضی اللہ عنہ نے جواباً عرض کیا کہ وہ کہتے ہیں: ابوموسیٰ اشعری کو کوفے کا وزیر بنایا جائے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے باغیوں کا مطالبہ تسلیم کیا اور بلا تاخیر حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو ان کا والی بنا دیا۔ [2]

آپ نے اہل کوفہ کو خط لکھا کہ دیکھو میں نے تمھارا مطالبہ پورا کیا اور ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ

---

[1] تاريخ الطبري:5/338. [2] تاريخ الطبري:5/339.

کو کوفے کا وزیر بنا دیا۔ اب تمھیں بھی چاہیے کہ تم اپنا وعدہ پورا کرو اور شرارتوں سے باز آ جاؤ۔ [1]

اس دوران میں آپ نے صحابۂ کرام کے مشورے سے مختلف شہروں میں تحقیقاتی ٹیمیں روانہ کیں تا کہ وہ اُن افواہوں کی حقیقت معلوم کر کے بتائیں جو ابنِ سبا اور اُس کے گماشتوں نے پھیلائی تھیں۔ تحقیقاتی ٹیموں نے رپورٹ دی کہ تمام ملک کے حالات معمول پر ہیں۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ تمام افواہیں جھوٹی ہیں۔ امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پھر بھی مطمئن نہیں تھے۔ آپ بھانپ گئے تھے کہ اندرون خانہ کھچڑی پک رہی ہے اور دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔ آپ نے اپنے تین وزرا حضرت عبداللہ بن عامر بن کریز رضی اللہ عنہ، حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کو فوری طور پر دارالخلافہ بلایا۔ دو سابقہ وزرا حضرت سعید بن عاص رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو بھی بلا بھیجا۔ یہ مجلس مشاورت نہایت خفیہ رکھی گئی تھی۔ آپ نے فرداً فرداً تمام وزرا سے حالات حاضرہ کے متعلق مشورہ طلب کیا۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ جہاں نرمی کی ضرورت ہے، وہاں نرمی برتیے، جہاں سختی کی ضرورت ہے، وہاں سختی سے کام لیجیے۔ معاشرے میں اچھے برے سبھی آدمی ہیں۔ آپ سب سے نرمی ہی برتتے ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ فتنوں کا دروازہ کھلنے والا ہے اور اب تک اگر کسی شے نے اسے بند کر رکھا ہے تو وہ نرمی ہی ہے۔ میں نرمی ہی کروں گا۔ یہ کہہ کر آپ نے مجلس مشاورت برخاست کر دی اور وزرا کو اپنے اپنے علاقوں میں جانے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

[1] تاريخ الطبري:5/343.

حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ شام جانے سے پہلے حاضر خدمت ہوئے اور دو تجاویز پیش کیں۔ انھوں نے عرض کی: ''یا امیر المومنین! حالات سازگار نہیں اور اس سے پہلے کہ پانی سر پر سے گزر جائے، آپ میرے ساتھ شام تشریف لے چلیے۔ وہاں میری عملداری ہے۔ وہاں آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچائے گا۔'' خلیفہ ثالث نے ان کی یہ تجویز مسترد کر دی اور فرمایا: ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمسائیگی کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتا۔'' حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی: ''تب میں آپ کی حفاظت کے لیے شام سے ایک فوجی دستہ بھیج دیتا ہوں۔ وہ یہاں رہ کر متوقع خطرات سے نمٹے گا اور ہنگامی صورتحال میں آپ کا اور اہل مدینہ کا دفاع کرے گا۔'' خلیفۂ ثالث نے ان کی یہ تجویز بھی منظور نہیں کی اور فرمایا: ''نہیں! اس سے مدینہ منورہ کی معیشت متأثر ہوگی۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پڑوسیوں کو اور مہاجرین و انصار کو کسی تنگی میں نہیں ڈالنا چاہتا۔''[1]

اس دوران میں آپ کو سبائیوں کے خطرناک عزائم کا پتہ چلا تو آپ نے صحابۂ کرام سے مشورہ کیا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ صحابۂ کرام نے مشورہ دیا کہ شر پسندوں کو قتل کر ڈالنا چاہیے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نہیں، جہاں تک ممکن ہوا، ہم لڑائی سے گریز کریں گے۔[2]

سبائیوں کے سردار مدینہ پہنچ چکے تھے۔ آپ نے انھیں بلایا اور صحابۂ کرام کے روبرو ان کے تمام اعتراضات کے شافی جواب دیے۔ صحابۂ کرام نے آپ کی تصدیق کی اور آپ کے جوابات کو درست قرار دیا۔ سبائی سرداروں نے بعض وزرا کی برطرفی اور ان کے بجائے دوسرے وزرا کی تعیناتی کا بھی مطالبہ کیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کا

[1] تاريخ الطبري:5/353. [2] تاريخ الطبري:5/354.

مطالبہ تسلیم کیا اور ان وزرا کو تبدیل کر دیا۔ سبائی گماشتوں کا یہ مقصد تو تھا نہیں کہ مدینہ آئیں، کچھ مطالبات کریں، وہ مطالبات تسلیم کر لیے جائیں تو واپس چلے جائیں۔ ان کا مقصد تو کچھ اور تھا۔ انھوں نے ملک بھر کے بلوائیوں کو پیغام بھیجا کہ پیش قدمی کا وقت آن پہنچا، چنانچہ کوفہ و بصرہ اور مصر کے بلوائی حاجیوں کا روپ دھار کر بارہ گروہوں میں روانہ ہوئے۔ ان کا بڑا شیطان عبداللہ بن سبا مصریوں کے ہمراہ تھا۔ ان کے چار گروہ عبدالرحمٰن بن عُدیس بلوی، کنانہ بن بشر تجیبی، سودان بن حمران سکونی اور قتیرہ بن فلان سکونی کے زیر قیادت آگے بڑھ رہے تھے۔ ان چار شیطانوں کا قائد مہاشیطان غافقی بن حرب عکی تھا۔ ان کی تعداد ایک ہزار تھی۔ کوفہ سے ایک ہزار کی تعداد میں جو چار گروہ روانہ ہوئے تھے، ان کے سردار زید بن صوحان عبدی، اشتر نخعی، زیاد بن نضر حارثی اور عبداللہ بن اصم جیسے بڑے شیطان تھے۔ ان سب کا رئیس عمرو بن اصم تھا۔ بصرہ کے ایک ہزار سرکش بھی چار گروہوں میں تقسیم ہو کر روانہ ہوئے تھے۔ ان کے بڑے شیاطین یہ تھے، حکیم بن جبلہ عبدی، ذریح بن عباد عبدی، بشر بن شریح قیسی اور ابن محرش، ان سب کا سربراہ حرقوص بن زہیر سعدی تھا۔ ابن سبا ان کے ہمراہ خوش و خرم جا رہا تھا کیونکہ اسے اپنا شیطانی منصوبہ کامیاب ہوتا نظر آ رہا تھا۔ شوال 35ھ میں یہ ملعون افراد مدینہ منورہ کے گردونواح میں جمع ہو چکے تھے۔ [1]

امیر المومنین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو ان سے مذاکرات کرنے کے لیے بھیجا۔ بلوائیوں نے وہی گھسی پٹی شرائط پیش کیں جن کے متعلق ان کی ذہن سازی کی گئی تھی۔ انھوں نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ حضرت عبداللہ بن

[1] تاريخ الطبري: 5/357.

عامر بن کریز رضی اللہ عنہ کو دوبارہ بصرہ کا گورنر بنایا جائے اور حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو بدستور کوفہ کا گورنر رہنے دیا جائے۔ امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تمام گروہوں سے مصالحت کی اور انھیں پورا یقین دلایا کہ ان کی شرائط تسلیم کی جائیں گی۔ (ان شرائط کی کوئی حیثیت نہیں تھی کیونکہ وہ لوگ سبائیوں کے پروپیگنڈے سے متأثر تھے ورنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا طرز حکومت تو نہایت صاف ستھرا اور عدل وانصاف پر مبنی تھا۔)

لڑائی کا جب کوئی جواز نہ رہا تو تمام وفود اپنے اپنے علاقوں کی طرف پلٹ گئے۔ لیکن فتنہ پردازوں کو یہ بات کیونکر ہضم ہوتی۔ انھیں اپنا منصوبہ ناکام ہوتا نظر آیا۔ انھوں نے فوراً نیا منصوبہ تشکیل دیا جس نے صلح کی تمام کوششوں پر پانی پھیر دیا۔ اہل مصر واپسی کے راستے پر گامزن تھے کہ اُنھیں ایک آدمی نظر آیا جو کبھی ان کے قافلے میں شامل ہوجاتا، کبھی ان سے جدا ہوجاتا اور یہ تاثر دیتا کہ وہ ان کی آنکھ بچا کر بھاگ لینا چاہتا ہے۔ گویا وہ خود دعوت دے رہا تھا کہ اسے پکڑ لیا جائے۔ قافلے والوں نے اسے پکڑ لیا۔ اس سے پوچھا کہ تم کون ہو اور تم کہاں کا ارادہ رکھتے ہو۔ اس نے کہا کہ میں امیر المومنین کا قاصد ہوں اور مصر کے عامل کی طرف امیر المومنین کا پیغام لے کر جارہا ہوں۔ انھوں نے اس کی تلاشی لی تو ایک خط برآمد ہوا جو امیر المومنین کی طرف سے عامل مصر کے نام تھا۔ اس پر امیر المومنین کی مہر ثبت تھی۔ اس میں مصر کے عامل کو لکھا گیا تھا کہ شر پسند جونہی مصر پہنچیں، انھیں سولی پر لٹکا دینا یا قتل کردینا۔ وہ خط لے کر مصری گروہ دوبارہ مدینہ آگئے۔ [1]

ان کے ساتھ ہی اہل کوفہ و بصرہ بھی مدینہ آگئے۔ امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ

[1] تاریخ الطبري: 379/5.

نے اس خط سے لاعلمی کا اظہار کیا اور فرمایا کہ یا تو دو گواہ لائیے یا مجھ سے اللہ کی قسم لے لیجیے کہ میں نے یہ خط لکھا، نہ املا کرایا نہ مجھے اس کا علم ہے۔ بلوائیوں نے آپ کی بات نہ مانی۔ وہ خط واقعی جعلی تھا جس کی سب سے بڑی دلیل یہ تھی کہ اہل کوفہ و بصرہ کو بھی اس خط کا پتہ تھا حالانکہ وہ اہل مصر سے الگ ہو کر اپنے شہروں کا رخ کر چکے تھے اور ان کے درمیان میلوں کی مسافت تھی۔ اہل کوفہ و بصرہ مدینہ سے مشرق کی طرف سفر کر رہے تھے اور اہل مصر مغرب کی طرف۔ اس کے باوجود دونوں قافلے ایک ساتھ مدینہ آ گئے۔ دراصل جن لوگوں نے بھاڑے کا ایک ٹٹو اہل مصر کی طرف روانہ کیا تھا انھی نے اپنا ایک اور گماشتہ اہل کوفہ وبصرہ کی طرف روانہ کیا تھا کہ انھیں مزعومہ خط کے بارے میں بتائے اور واپس لے آئے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ کہہ کر ان کا بھانڈا بیچ چوراہے کے پھوڑ ڈالا تھا کہ اہل کوفہ وبصرہ! تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ مصریوں نے یہ خط پکڑا ہے؟

ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا تو آپ نے فرمایا: ''حقیقت یہ ہے کہ تم اپنے منصوبے کے مطابق یونہی تھوڑا سا چل کر واپس آ گئے ہو۔''[1] آپ نے قسم کھا کر کہا کہ بخدا! یہ تمام منصوبہ مدینہ میں بنایا گیا ہے۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ اشتر نخعی اور حکیم بن جبلہ اہل کوفہ وبصرہ کے ہمراہ واپس جانے کے بجائے مدینہ منورہ میں ٹھہر گئے تھے۔ غالب گمان یہی ہے کہ خط کا منصوبہ انھی کا تشکیل کردہ تھا۔

دوسری بڑی دلیل اس خط کے جعلی ہونے کی یہ ہے کہ اگر وہ قاصد واقعی امیر المومنین

[1] تاریخ الطبري:5/359.

نے بھیجا ہوتا تو وہ اہل مصر کے ساتھ ساتھ کبھی نہ چلتا اور نہ ویسی مشکوک حرکتیں کرتا کہ فوراً پکڑا جاتا بلکہ اہل مصر کو تو اس کی ہوا بھی نہ چھوتی۔

تیسری بڑی دلیل اس خط کے مزعومہ ہونے کی یہ ہے کہ امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا عامل مصر میں تھا ہی نہیں وہ تو وہاں سے روانہ ہو کر فلسطین میں عقبہ تک پہنچ چکا تھا اور اس نے امیر المومنین کو روانگی کی اطلاع بھی کر دی تھی۔ اس کا قاصد اس وقت مدینہ میں موجود تھا۔

بلوائیوں نے یہ تمام باتیں نہیں سنیں نہ انھیں سننی تھیں۔ انھوں نے سب سے پہلے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مسجد میں آنے سے روکا، پھر آپ کے گھر کا محاصرہ کر لیا۔ صحابۂ کرام دفاع کے لیے آئے تھے لیکن آپ نے انھیں لڑائی کرنے سے منع کر دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی کے باعث آپ کو یقین تھا کہ اب آپ کو شہید کر دیا جائے گا۔ آپ چاہتے تھے کہ آپ کی وجہ سے کشت وخون نہ ہو۔

محاصرہ چالیس روز جاری رہا۔ بلوائیوں نے اس دوران میں کھانے پینے کا سامان بھی گھر میں نہیں جانے دیا۔ آخر 18 ذی الحج 35ھ کو بلوائی گھر میں گھس آئے اور امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو نہایت بے دردی سے شہید کر دیا۔ آپ کا دفاع کرتے ہوئے حضرت مغیرہ بن اخنس رضی اللہ عنہ اور آپ کا ایک غلام بھی شہید ہو گئے۔ آپ کی اہلیہ محترمہ حضرت نائلہ رضی اللہ عنہا کے ہاتھ کی انگلیاں کاٹ ڈالی گئیں، ان سے بدتمیزی کی گئی اور پہلوؤں میں تلوار کے چرکے لگا کر شدید زخمی کر دیا گیا۔ جن بلوائیوں نے گھر میں گھس کر آپ پر حملہ کیا ان میں سودان بن حمران، قتیرہ سکونی، کلثوم تجیبی اور دیگر سبائی شامل تھے۔ سودان بن حمران، قتیرہ اور کلثوم آپ کے غلاموں کے ہاتھوں مارے گئے۔

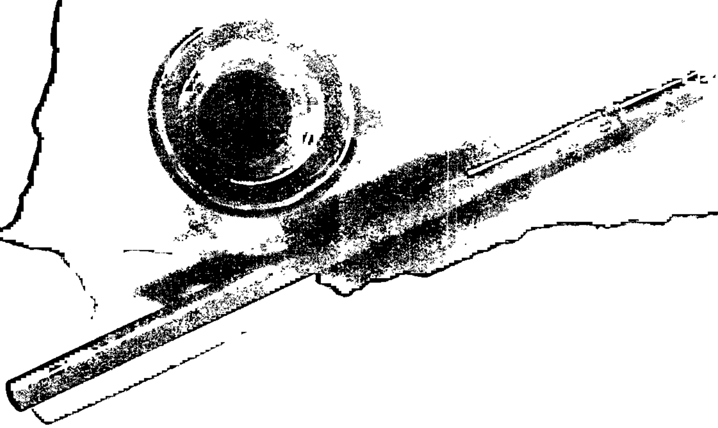
جس شقی القلب نے آپ کو شہید کیا تھا اسے موت الاسود کہا جاتا تھا۔ وہ بچ نکلا تھا۔ قریش کے چار نوجوان اس روز آپ کا دفاع کرتے ہوئے زخمی ہوئے تھے: حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت محمد بن حاطب رضی اللہ عنہ اور حضرت مروان بن حکم رحمہ اللہ۔ [61]

تیسرے خلیفۂ راشد کا قتل بہت بڑا اور نہایت بہیمانہ اقدام تھا۔ تاریخ اسلام میں اس سے بڑا فتنہ پیش نہیں آیا۔ اس کے نتیجے میں امت ہمیشہ کے لیے دھڑوں میں بٹ گئی اور فتنوں کا دروازہ چوپٹ کھل گیا۔ اہل اسلام ان فتنوں کے حصار سے آج تک نہیں نکل پائے۔

---

[61] تاريخ الطبري:5/407.

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ



حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا ایک فرمان

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: ''غزوۂ تبوک کے موقع پر نبی ﷺ نے علی بن ابی طالب کو مدینہ منورہ میں خواتین اور بچوں کی نگہبانی پر مامور کیا۔ انھوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! آپ مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑ کر جاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: ''کیا تمھیں پسند نہیں کہ میرے ساتھ تمھاری حیثیت وہی ہو جو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہارون (علیہ السلام) کی تھی۔ اتنی بات البتہ ضرور ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔'' [1]

---

[1] صحيح البخاري، حديث:4416، و صحيح مسلم، حديث:2404، واللفظ لمسلم.





حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ ابوطالب کے بیٹے تھے۔ ابوطالب روپے پیسے کے لحاظ سے متوسط طبقے کے آدمی تھے۔ وہ اپنے یتیم بھتیجے محمد سے بڑی محبت کرتے تھے۔ اپنے والد عبدالمطلب کی وفات کے بعد قبیلے کے سربراہ وہی تھے اور انھی نے ننھے محمد کی پرورش کا ذمہ لیا تھا۔ محمد کو وہ سفر وحضر میں اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ محمد جب نبی بنے اور دعوت الی اللہ کا آغاز کیا تو ابوطالب نے غیر مشروط طور پر ان کی زبردست حمایت کی۔

ان کا جینا مرنا محمد کے ساتھ تھا۔ چونکہ قبیلے کے سردار تھے، تمام قبیلے کو آمادہ کر لیا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جیسی بھی مشکل پیش آئے گی، تمام افراد ان کے دوش بدوش کھڑے رہیں گے اور ان کے ہمراہ تکلیف اٹھائیں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کا بڑا سہارا تھا۔ وہ جب تک زندہ رہے، مشرکین مکہ آپ کا بال بھی بیکا نہیں کر سکے۔ انھوں نے وفات پائی تو مشرکین مکہ کی دیدہ دلیری یہاں تک بڑھی کہ انھوں نے آپ کو جان سے مار ڈالنے کا گھناؤنا منصوبہ بنایا۔ تب آپ نے باذن الٰہی یثرب کی طرف ہجرت کی۔ ابوطالب نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ ان کی چھ اولادیں تھیں۔ چار بیٹے، طالب، عقیل، جعفر اور علی۔ دو بیٹیاں، ام ہانی اور جمانہ۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی والدہ کا نام فاطمہ تھا۔ فاطمہ بنت اسد بن ہاشم بن عبد مناف۔ بڑی نیک اور فاضل خاتون تھیں۔ ننھے محمد کو انھوں نے ماں کا پیار دیا تھا۔ نبیِ کریم ﷺ ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ وہ اسلام لائی تھیں۔ یثرب کی طرف ہجرت بھی کی تھی اور بعدازاں وہیں وفات پائی تھی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کاشانۂ نبوی میں پرورش پائی تھی۔ ابوطالب کی آمدنی کم تھی اور وہ بوڑھے بھی ہو چکے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ابھی بچے تھے۔ نبیِ کریم ﷺ، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے شادی کر کے ان کا کاروبار سنبھال چکے تھے۔ ابوطالب کی کم آمدنی اور کثیر اخراجات کا آپ کو بخوبی اندازہ تھا۔ قریش ان دنوں شدید مالی بحران کا شکار تھے۔ ایک روز آپ اپنے دوسرے چچا عباس بن عبدالمطلب کے ہاں گئے جو خاصے مالدار تھے۔ آپ نے ان سے کہا کہ آپ کے بھائی ابوطالب بیچارے نادار ہیں۔ اخراجات بھی ان کے خاصے ہیں۔ حالیہ معاشی بحران نے انھیں بہت نقصان پہنچایا ہے۔ میرے خیال میں ہمیں ان کا ہاتھ بٹانا چاہیے۔ ایسا کرتے ہیں کہ ان کے ایک بیٹے کی پرورش کا ذمہ آپ لے لیجیے۔ اور ایک کو میں اپنی کفالت میں لے لیتا ہوں۔

عباس نے رضامندی کا اظہار کیا تو دونوں چچا بھتیجا ابوطالب کے ہاں گئے اور اُن سے کہا کہ جب تک لوگ حالیہ معاشی بحران سے نہیں نکلتے، آپ کے گھریلو اخراجات ہم اٹھاتے ہیں۔ ہم نے سوچا ہے کہ آپ کا ایک بیٹا عباس کے ہاں پرورش پائے اور ایک میرے ہاں۔ یوں آپ کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔

ابوطالب نے کہا کہ عقیل کو اگر تم لوگ میرے لیے چھوڑ دیتے ہو تو پھر جو چاہے سو کرو، چنانچہ نبیِ کریم ﷺ نے علی کی پرورش کا ذمہ اٹھایا اور عباس نے جعفر کو سنبھال

لیا۔ یوں حضرت علی رضی اللہ عنہ کاشانۂ نبوی میں پرورش پاتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پروانۂ رسالت عطا فرمایا تو وہ بھی آپ پر ایمان لے آئے۔[1]

پہلے پہل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریق کار یہ تھا کہ نماز کا وقت ہوتا تو آپ مکہ کی گھاٹیوں میں نکل جاتے اور چھپ کر نماز ادا کرتے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اکثر آپ کے ہمراہ ہوتے۔

ایک روز ابوطالب نے دونوں کو نماز پڑھتے دیکھ لیا۔ انھیں بہت تعجب ہوا۔ انھوں نے نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ بھتیجے یہ کیسا مذہب ہے جس کی تم پیروی کرتے ہو، آپ نے جواب دیا: چچا! یہ اللہ کا، اس کے فرشتوں کا، اس کے رسولوں کا اور ہمارے جد امجد ابراہیم علیہ السلام کا مذہب ہے۔ مجھے اللہ نے اپنا رسول بنایا ہے۔ میں آپ کی بھلائی سب سے بڑھ کر چاہتا ہوں، اسی لیے آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ راہ ہدایت اپنا لیجیے۔ اس سلسلے میں آپ کا یہ فرض ہے کہ آپ میری دعوت قبول کریں اور مجھ سے بھرپور تعاون کریں۔ ابوطالب نے کہا کہ بھتیجے! میں اپنے آباء و اجداد کا مذہب نہیں چھوڑ سکتا، ہاں اتنا ضرور کہتا ہوں کہ جب تک زندہ ہوں، کوئی تمھارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا: بیٹا! یہ کیسا مذہب ہے جس پر تم عمل پیرا ہو۔ انھوں نے جواب دیا: ''ابا! میں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آیا ہوں۔ میں ان کے ہمراہ نماز پڑھتا ہوں۔'' ابوطالب نے کہا: ''ہاں، ٹھیک ہے۔ اس کے ساتھ رہو۔ وہ تمھیں بھلائی ہی کی راہ دکھلائے گا۔''[2]

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 264/1. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 265/1، البداية والنهاية لابن كثير: 29/3.

یوں حضرت علی رضی اللہ عنہ ان مقدس افراد میں شامل تھے جو پہلے پہل اسلام لائے اور سابقون اولون کے بلند مرتبہ لقب سے پہچانے جاتے تھے۔ اسلام کی دعوت جن مراحل سے گزر کر پروان چڑھی تھی، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نہایت قریب سے ان کا مشاہدہ کیا تھا۔ انھوں نے مکہ کے کمزور مسلمانوں کو ظلم وستم کی چکی میں پستے دیکھا تھا۔ پھر وہ یادگار وقت بھی آیا جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یثرب کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ جس رات اللہ کے نبی کو ہجرت کرنی تھی، مشرکین مکہ نے آپ کے گھر کا گھیراؤ کیا ہوا تھا۔ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ میری سبز حضرمی چادر اوڑھ کر میرے بستر پر سو رہو۔ کوئی تمھارا بال بھی بیکا نہیں کر پائے گا۔[1]

اللہ تعالیٰ نے حملہ آوروں کی آنکھیں اندھی کر ڈالیں۔ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے نرغے سے صحیح سلامت نکل آئے اور ہجرت کے راستے پر گامزن ہوگئے۔ ادھر حضرت علی رضی اللہ عنہ صبح سویرے بیدار ہوئے اور دروازے کے باہر ان حملہ آوروں پر تمسخر آمیز نظر ڈالی جو بیچارے ہاتھوں میں ننگی تلواریں لیے سو رہے تھے۔ انھیں بعد ازاں دھوپ کی تمازت نے بیدار کیا تھا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اگلے تین روز مکہ میں گزارے۔ نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں مامور کیا تھا کہ لوگوں کی امانتیں واپس کرتے آئیں جو آپ کے گھر میں پڑیں تھیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تین ہی دن میں تمام معاملات نمٹائے اور مدینہ روانہ ہوگئے۔

مدینہ منورہ میں آمد

مدینہ منورہ میں مسلمانوں کے قدم جم گئے اور انھیں اطمینان میسر آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

[1] البداية والنهاية لابن كثير: 3/196.

نے مہاجرین و انصار میں بھائی چارہ قائم کیا۔ بعدازاں مسجد نبوی کی تعمیر عمل میں آئی اور میثاق مدینہ تحریر کیا گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا رشتۂ مواخات حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ کے ساتھ قائم ہوا۔[1]

اگلے مرحلے میں غزوات و سرایا کی تحریک کا آغاز ہوا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دلیرانہ کردار نمایاں طور پر سامنے آیا۔ غزوۂ بدر میں فریقین نے ایک دوسرے کو دعوت مبارزت دی تو مسلمانوں کی جانب سے جو تین شہ زور آگے بڑھے ان میں ایک حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے۔ انھوں نے مدمقابل ولید بن عتبہ کو دیکھتے ہی دیکھتے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

غزوۂ بدر کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دختر رسول حضرت فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شادی ہوگئی۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے ان کی تین اولادیں تھیں۔ حضرت حسن، حضرت حسین اور حضرت ام کلثوم۔ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات حسرت آیات کے چھے ماہ بعد حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی خالق حقیقی سے جا ملیں۔

غزوۂ احد میں مسلمانوں کے علمبردار حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے جام شہادت نوش کیا تو گرتے ہوئے جھنڈے کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تھام لیا۔ مشرکین مکہ کے علمبردار ابوسعد بن ابی طلحہ نے دعوت مبارزت دی تو وہ آگے بڑھے اور مقابلے میں آئے۔ دونوں نے دو دو چار چار ہاتھ مارے۔ آخر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک ہاتھ ایسا مارا کہ مدمقابل زمین پر جا رہا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فوراً پلٹ آئے اور اس کا کام تمام نہیں کیا۔ کسی نے کہا کہ اس کا کام تمام کر کے ہی آتے۔ انھوں نے جواب دیا: کہ بچارے کی شرمگاہ کھل گئی تھی مجھے اس پر ترس آ گیا تھا۔

---

[1] الكاشف للذهبي: 218/3.

حضرت محمد ﷺ کے پیروکار جنگ کے دہکتے شعلوں میں بھی ان اخلاقی اقدار کا لحاظ کرتے تھے جو انھیں اسلامی تعلیمات سے حاصل ہوئی تھیں۔

غزوۂ خندق میں جس میں کھل کر لڑائی نہیں ہوئی تھی، اس غزوے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا جرأت مندانہ کردار تاریخ کے اوراق میں سنہری حروف میں لکھا گیا۔

غزوہ خندق میں مسلمانوں نے مدینہ کے دفاع کے لیے اس کے ایک طرف لمبی چوڑی اور خوب گہری خندق نکالی تھی۔ ایک جگہ سے خندق ذرا کم گہری تھی۔ مشرکین مکہ کے چند گھڑسواروں نے عمرو بن عبدود کی قیادت میں وہاں سے خندق عبور کر لی۔ دوسری طرف حضرت علی رضی اللہ عنہ نے چند مجاہدین کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ آپ نے عمرو بن عبدود سے کہا کہ عمرو! تم نے اللہ سے وعدہ کیا تھا کہ قریش کا جو بھی آدمی تمھیں دو اچھی باتیں اپنانے کی دعوت دے گا، تم اس کا کہا ضرور مانو گے۔ وہ بولا۔ ہاں۔ یہ تو میں نے ضرور کہا تھا۔ فرمایا تو میں تمھیں اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلاتا ہوں اور اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ وہ بولا مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ فرمایا تو پھر سواری سے اترو۔ ذرا دو دو ہاتھ ہو جائیں۔ ابن عبدود نے کہا کہ بھتیجے! کیوں؟! واللہ! میں تمھیں مار ڈالنا نہیں چاہتا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا لیکن میں تمھیں مار ڈالنا چاہتا ہوں۔ عمرو بن عبدود کو اس بات پر طیش آ گیا۔ اس نے گھوڑے سے اتر کر اس کی کونچیں کاٹ ڈالیں اور آگے بڑھا۔ تلواروں کے وار پے بہ پے پڑنے لگے۔ آخر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک وار ایسا بھرپور کیا کہ ابن عبدود کا کام تمام ہو گیا۔ ان کے دوسرے گھڑسواروں نے یہ ہولناک منظر دیکھا تو وہیں سے بھاگ گئے۔ [1]

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 241/3.

غزوۂ خندق میں مشرکین مکہ اور ان کے حلیف قبائل شکست فاش سے دو چار ہوئے۔ بعدازاں رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں منادی کرادی کہ جو آدمی یہ اعلان سن رہا ہے اور وہ مطیع و تابع فرمان ہے، اسے چاہیے کہ نماز عصر دیار بنو قریظہ میں ادا کرے۔ دراصل آپ یہود بنی قریظہ کو ان کی بدعہدی کا مزہ چکھانا چاہتے تھے۔

مسلمانوں نے ارشاد نبوی کی تعمیل کرتے ہوئے فوراً دیار بنی قریظہ کا رخ کیا۔ ہر اول دستے کے سالار حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ تھے۔ علم نبوی ان کے ہاتھ میں تھا۔ وہ یہود بنو قریظہ کے قلعے کے قریب پہنچے تو رسول اللہ ﷺ کے متعلق یہودیوں کی بد زبانیاں ان کے کانوں میں پڑیں۔ وہیں سے پلٹ آئے۔ راستے میں رسول اللہ ﷺ سے ملاقات ہوئی جو مسلمانوں کے جلو میں دیار بنی قریظہ کی طرف رواں دواں تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! اگر آپ ان خبیثوں کے قریب نہ جائیں تو میں سمجھتا ہوں کوئی مضائقہ نہیں۔ فرمایا کیوں۔ میرا خیال ہے تم نے ان کی بدزبانیاں سن لی ہیں۔ عرض کیا: جی ہاں، اے اللہ کے رسول! فرمایا اگر وہ مجھے دیکھ لیتے تو ایسا کچھ نہ کہتے۔

آپ ان کے قلعے کے قریب گئے تو بآواز بلند کہا: ارے بندروں کے بھائیو! کیا اللہ نے تمھیں ذلیل و رسوا کیا اور تم پر اپنا عذاب نازل کیا؟!" انھوں نے جواب دیا کہ ابوالقاسم! آپ اس امر سے ناواقف تو نہیں۔ مسلمانوں نے پچیس روز تک ان کے قلعوں کا محاصرہ کیے رکھا۔ آخر انھوں نے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے فیصلے پر ہتھیار ڈال دیے۔

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ دور جاہلیت میں ان کے حلیف تھے۔ انھوں نے فیصلہ کیا

کہ یہود بنی قریظہ میں جتنے مرد لڑائی کے قابل ہیں انھیں قتل کر دیا جائے۔ عورتوں اور بچوں کو غلام بنالیا جائے اور ان کے اموال مسلمانوں میں تقسیم کر دیے جائیں۔ نبی ﷺ نے ان کے اس فیصلے کو سراہتے ہوئے فرمایا کہ تم نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق فیصلہ کیا ہے۔ [1]

صلح حدیبیہ کے موقع پر قریش مکہ اور مسلمانان مدینہ کے درمیان امن کا جو معاہدہ ہوا تھا، قریش مکہ نے اس معاہدے کی خلاف وزری کی تو نبیِ کریم ﷺ نے مکہ پر حملہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ نے قریش کو خط لکھا کہ نبیِ کریم ﷺ مکہ پر چڑھائی کرنا چاہتے ہیں، اس لیے بچاؤ کا سامان کر لو۔ انھوں نے وہ خط بنی عبدالمطلب کی ایک باندی سارہ کے حوالے کیا، اسے اجرت دی اور کہا کہ یہ خط قریش کو پہنچا دو۔ اس نے وہ خط سر کے بالوں میں رکھا اور بالوں کی چوٹی بنا کر نکل کھڑی ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ کو وحی کے ذریعے سے خبر مل گئی کہ حاطب نے قریش کو خط لکھا ہے اور خط پہنچانے والی عورت فلاں جگہ راستے میں ہے۔ آپ نے فوری طور پر حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہما کو روانہ کیا اور اُن سے فرمایا: ''فلاں جگہ آپ کو ایک عورت ملے گی، اس کے پاس ایک خط ہے جو حاطب بن ابی بلتعہ نے قریش کو لکھا ہے، وہ خط لے آیئے۔''

دونوں حضرات نہایت تیزی سے روانہ ہوئے اور اس عورت کو جا لیا۔ اسے سواری سے اتارا اور اس کے سامان کی تلاشی لی۔ کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس عورت سے فرمایا: میں حلفیہ کہتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ سچے ہیں اور آپ کی دی ہوئی

---

[1] صحيح البخاري، حديث:3043، ومسند أحمد:142/6.

خبر بھی بالکل سچی ہے، اس لیے یا تو تم وہ خط ہمارے حوالے کردو یا پھر ہم تمھاری جامہ تلاشی لیتے ہیں۔ عورت نے جب یہ دیکھا کہ یہ خط لیے بنا نہیں ٹلیں گے تو اس نے سر کے بال کھولے اور خط نکال کر دے دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے وہ خط لا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ خدمت نبوی میں ایسے چاق چوبند سپاہی کی حیثیت سے رہتے تھے جو سپہ سالار کے احکامات کا منتظر رہتا ہے۔ سپہ سالار جو حکم دے وہ فوراً اس کی تعمیل کے لیے سرگرم عمل ہو جاتا ہے۔

غزوۂ تبوک کے موقع پر نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں رہنے کا حکم دیا۔ منافقین نے شور مچا دیا کہ علی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بارخاطر ہیں، اسی لیے آپ نے انھیں مدینے میں رہنے دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے منافقین کی بکواس سنی تو اسلحہ اٹھایا اور اکیلے ہی نکل کھڑے ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبوک کی جانب عازم سفر تھے اور فی الحال جرف میں پڑاؤ کیے ہوئے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ خدمت نبوی میں پہنچے تو عرض کیا کہ اے اللہ کے نبی! آپ مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ فرمایا: میں نے تم کو تمھارے اور اپنے اہل خانہ کی حفاظت کے لیے مدینہ منورہ میں رہنے کا حکم دیا تھا۔ ہم دونوں میں سے کسی ایک کو مدینے میں رہنا تھا۔ اب میں مدینہ میں رہتا ہوں یا پھر تم۔'' پھر فرمایا: کیا تمھیں پسند نہیں کہ میرے ساتھ تمھاری وہی حیثیت ہو جو موسیٰ کے ساتھ ہارون کی تھی۔ اتنی بات البتہ ضرور ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔''[2]

[1] صحيح البخاري، حديث:6259، والسيرة النبوية لابن هشام: 16/4، والكامل لابن الأثير: 242/2. [2] صحيح البخاري، حديث:4416، وصحيح مسلم، حديث:2404.

آپ کی بیان کردہ وجوہات اور اطمینان بخش ارشادات سن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بے حد تسلی ہوئی اور وہ مدینہ لوٹ آئے۔ اس موقع پر ان کا مدینہ میں رہنا اور نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کے متعلق یہ فرمانا کہ اب یا تو میں مدینہ میں رہتا ہوں یا پھر تم، اس امر کا آئینہ دار ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں آپ کے نجی معاملات کے حوالے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا جو مقام و مرتبہ تھا وہ کسی اور کو حاصل نہیں تھا۔

9 ھ میں حج کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیر حج بنا کر بھیجا۔ صحابۂ کرام کی بڑی تعداد ان کے ہمراہ حج کو روانہ ہوئی۔ اُدھر وہ روانہ ہوئے اِدھر سورۂ توبہ نازل ہوئی۔ سورۂ توبہ میں دو چار ایسی اہم باتیں نازل ہوئی تھیں کہ حج کے موقع پر ان کا اعلان کرنا ضروری تھا۔ ان میں سے ایک بات جاری معاہدے کے برقرار رہنے کے متعلق تھی۔ دستورِ عرب کے مطابق جاری معاہدے کو برقرار رکھنے یا اس کے توڑنے کا اعلان سردارِ قبیلہ یا اس کے خاندان کے کسی فرد کو کرنا ہوتا تھا۔ یوں حضور نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس مقصد کے لیے روانہ فرمایا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے ہمراہ ابھی ذوالحلیفہ میں تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جا پہنچے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انھیں دیکھتے ہی دریافت فرمایا کہ امیر ہو یا مامور (ماتحت)؟ انھوں نے کہا: مامور (ماتحت) ہی ہوں، چنانچہ یہ دونوں حضرات روانہ ہوئے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ امیر حج کے فرائض انجام رہے اور حضرت علی جا بجا یہ اعلان کرتے پھرے کہ کافر جنت میں نہیں جائے گا۔ آئندہ کوئی مشرک حج نہیں کر پائے گا۔ نہ کوئی برہنہ ہو کر کعبہ کا طواف کرے گا۔ جاری معاہدے اپنی مدت پوری کریں گے۔ [1]

---

[1] البداية والنهاية: 5/43.

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بڑی منصف مزاج طبیعت پائی تھی۔ اپنے دورِ خلافت میں عمرو بن سلمہ کو اصفہان کا وزیر بنایا۔ ایک دفعہ وہ بہت سا روپیہ، شہد اور گھی کی بھری کئی مشکیں لائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی ام کلثوم رضی اللہ عنہا نے عمرو بن سلمہ کو پیغام بھیجا کہ تھوڑا سا شہد اور گھی بھیجو۔ انھوں نے ایک برتن میں شہد اور ایک میں گھی ڈال کر ان کے ہاں بھیج دیا۔ اگلے روز حضرت علی رضی اللہ عنہ نے وہ روپیہ، گھی اور شہد مسلمانوں میں تقسیم کرنے کے لیے منگایا تو دو مشکیں کم نکلیں۔ عمرو سے پوچھا تو اس نے گول مول جواب دیا۔ آپ نے ذرا سختی سے باز پُرس کی تو اُس نے بتادیا کہ دونوں مشکوں کا شہد اور گھی آپ کی صاحبزادی کے ہاں بھیجا گیا ہے۔ آپ نے وہ تمام شہد اور گھی صاحبزادی کے ہاں سے واپس منگالیا۔ ایک تاجر سے فرمایا کہ ذرا آنکیے، کتنے روپیہ کا شہد اور گھی کم ہے۔ تاجر نے آنکا تو تین روپیہ کا شہد اور گھی کم نکلا، چنانچہ پہلے وہ تین روپے صاحبزادی کے ہاں سے منگائے، پھر وہ تمام اشیاء مسلمانوں میں تقسیم کر دیں۔

یہ تھے حضرت علی رضی اللہ عنہ جو مدرسۂ نبوی کے فیض یافتہ تھے۔ ان کی عدل گستری کا ایک اور واقعہ سنیے جس کے راوی ہیں امام عامر شعبی۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی ایک زرہ جنگ صفین کے دن گم ہوگئی تھی جو بعد ازاں انھیں ایک عیسائی کے پاس دکھائی دی۔ آپ اسے ساتھ لیے اپنے مقرر کردہ قاضی شریح کے ہاں گئے اور قاضی صاحب سے کہا کہ یہ زرہ میری ہے۔ عیسائی نے کہا کہ نہیں، یہ زرہ میری ہے۔ قاضی صاحب نے امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ثبوت طلب کیا۔ آپ نے کہا کہ ثبوت تو میرے پاس کوئی نہیں۔

قاضی صاحب نے عیسائی کے حق میں فیصلہ دیا اور زرہ اس کے حوالے کردی۔ وہ

زرہ لے کر گیا لیکن تھوڑی دیر میں لوٹ آیا۔ وہ بولا یہ تو انبیا کے سے فیصلے ہیں۔ امیرالمومنین مجھے اپنے قاضی کے رو برو لے گئے اور ان کے قاضی نے ان کے خلاف فیصلہ دیا۔ یہ کہہ کر اس نے کلمہ پڑھا اور مسلمان ہوگیا۔ اس نے اعتراف کیا کہ یہ امیرالمومنین ہی کی زرہ ہے۔ صفین جاتے ہوئے راستے میں ان سے گر پڑی تھی۔ امیرالمومنین اس کے قبول اسلام سے بہت خوش ہوئے۔ آپ نے وہ زرہ اسے تحفے میں دے دی اور مزید ایک گھوڑا بھی انعام میں دیا۔ [1]

[1] الکامل فی التاریخ لابن الأثیر:3/400.



بیعت خلافت

جس روز خلیفۂ ثالث امیر المومنین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو ظالمانہ طور پر شہید کر دیا گیا، اسی روز بہت سے لوگ جن میں جلیل القدر صحابہ حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کے علاوہ دیگر مہاجرین اور انصار بھی شامل تھے، حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ خلیفۂ ثالث کو شہید کر دیا گیا ہے۔ اب ضروری ہے کہ نئے خلیفہ کی بیعت کی جائے۔ اِس لیے نئے خلیفہ کے طور پر ہم آپ کی بیعت کرنے آئے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ مجھے خلیفہ بننے کی کچھ ضرورت نہیں، میرے علاوہ آپ جسے بھی خلافت کے لیے انتخاب کریں گے، مجھے اس کی بیعت کے لیے تیار پائیں گے۔ یہ کہہ کر آپ نے حضرت طلحہ بن عبید اللہ اور حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہما کی طرف دیکھا اور کہا کہ میں آپ دونوں میں سے کسی ایک کی بیعت کرتا ہوں۔ ان دونوں نے کہا: نہیں بلکہ ہم آپ کی بیعت کرتے ہیں۔ دیگر صحابۂ کرام نے بھی کہا کہ اس وقت آپ سے بڑھ کر خلافت کا حقدار کوئی نہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کا اصرار دیکھا تو فرمایا: میری بیعت خفیہ طور پر نہیں ہوگی۔ میں مسجد میں جاؤں گا اور علانیہ بیعت لوں گا، چنانچہ تمام لوگ مسجد میں جمع ہوئے۔

حضرات طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما بھی مسجد میں آئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان سے ایک مرتبہ پھر کہا کہ اگر آپ چاہتے ہیں تو میں آپ کی بیعت کر لیتا ہوں۔ ان دونوں نے کہا نہیں، ہم آپ ہی کی بیعت کریں گے۔ یوں تمام لوگوں نے بشمول صحابۂ کرام اور مہاجرین و انصار متفقہ طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی۔ اگلے روز جمعے کا دن تھا۔ آپ مسجد میں تشریف لائے اور منبر پر بیٹھے تو ان صحابۂ کرام نے بھی آ کر بیعت کی جو کل بیعت کرنے سے رہ گئے تھے۔ [1]

اس موقع پر صاحبزادے حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے آپ کو مشورہ دیا کہ جب تک تمام ملک سے نمائندہ وفود آ آ کر آپ کی بیعت نہ کر لیں، کسی سے بیعت نہ لیجیے۔ آپ نے جواب دیا کہ بات تو ساری اہل مدینہ کی ہے۔ اہل مدینہ نے بیعت کر لی تو بیعت واقع ہوگئی۔ [2]

پھر آپ نے تمام ملک میں اپنے وزرا روانہ کیے۔ اس موقع پر بھی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے آپ کو مشورہ دیا کہ ملک کے حالات بہت خراب ہیں۔ عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت پر لوگ غم و غصے سے بھرے ہوئے ہیں، اس لیے آپ فی الحال عثمان (رضی اللہ عنہ) کے وزرا کو برقرار رہنے دیجیے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ مشورہ بھی قبول نہیں کیا۔'' [3]

ادھر ام المومنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے خلیفۂ شہید کی خون آلود قمیص اور ان کی اہلیہ حضرت نائلہ رضی اللہ عنہا کی بریدہ انگلیاں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما کے ہاتھ شام بھجوا دی تھیں۔ اہل شام جن میں بڑی تعداد صحابۂ کرام کی تھی، ان چیزوں کو سامنے رکھے رو رہے

[1] البداية والنهاية لابن كثير: 227/4. [2] تاريخ الطبري: 482/2. [3] تاريخ الطبري: 461/5.

تھے۔ انھوں نے شام کے والی نامور صحابیٔ رسول حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ سے کہہ دیا تھا کہ عثمان (رضی اللہ عنہ) ہمارے خلیفہ تھے۔ ہمیں ان کے خون کا بدلہ لینا ہے۔ اگر آپ ہمیں بدلہ دلوا سکتے ہیں تو ٹھیک ورنہ ہم کسی اور کو امیر بنا لیتے ہیں۔ [1]

ان حالات میں حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کا مطالبہ کیا اور یہ اعلان کیا کہ جب تک قاتلین عثمان ہمارے حوالے نہیں کیے جاتے، ہم علی بن ابی طالب کی بیعت نہیں کریں گے۔ مدینہ میں ہی حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ نے بھی حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مطالبہ کر دیا تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے، قاتلین عثمان سے قصاص لیجیے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ عذر پیش کیا تھا کہ میں ایسے افراد کو کیونکر کٹھرے میں کھڑا کروں جو میرے قابو میں نہیں۔ ذرا حالات تو قابو میں آنے دیجیے۔ ورنہ ہم خانہ جنگی کا شکار ہو جائیں گے۔ [2]

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں بصرہ جاتا ہوں اور وہاں سے ایک لشکر لے آتا ہوں، پھر ہم قاتلین عثمان سے بدلہ لے پائیں گے۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے بھی کہا کہ میں کوفہ جا کر ایک لشکر لے آتا ہوں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس پر بھی راضی نہیں ہوئے۔ [3]

در اصل قاتلین عثمان، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں شامل تھے اور ان کا بڑا اثر و رسوخ تھا۔ آپ کو خدشہ تھا کہ ان پر فرداً فرداً ہاتھ ڈالا گیا تو ان کے لیے ان کے تمام اہل قبیلہ بھی بھڑک اٹھیں گے اور لڑائی کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا مکہ سے مدینہ واپس آ رہی تھیں کہ راستے میں شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کی خبر ملی۔ وہیں سے واپس پلٹ گئیں اور مکہ پہنچ کر اعلان کر دیا کہ عثمان کے

---

[1] الأنساب: 4/418. [2] تاريخ الطبري: 5/460. [3] تاريخ الطبري: 5/361.

خون کا بدلہ لیا جائے گا۔ ادھر حضرت طلحہ بن عبیداللہ اور زبیر بن عوام رضی اللہ عنہما نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے اجازت مانگ لی تھی کہ ہمیں مدینہ سے جانے دیجیے، پھر ہم جانیں اور ہمارا کام۔ آپ نے انھیں اجازت دے دی۔ [1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے وزرا ملک کے مختلف شہروں میں پہنچ رہے تھے۔ شام کی وزارت آپ نے حضرت عبداللہ بن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو دینی چاہی لیکن انھوں نے معذرت کر لی اور کہا کہ مجھ سے یہ بارگراں نہیں اٹھایا جائے گا۔ وہ اسی رات مدینہ سے روانہ ہو کر مکہ پہنچ گئے۔'' [2]

ان کے انکار پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ کو شام کی وزارت پر روانہ کیا۔ وہ شام کے قریب پہنچے تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے گھڑسوار دستے نے استقبال کیا۔ اس کے سالار نے حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آپ عثمان (رضی اللہ عنہ) کے وزیر ہیں تو خوش آمدید۔ کسی اور کی طرف سے آئے ہیں تو بہتر ہوگا کہ یہیں سے پلٹ جائیے۔ حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ خاموشی سے پلٹ آئے۔ [3]

دوسری طرف حضرات طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما مدینہ سے نکل کر ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں مکہ تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید ہوئے چار مہینے گزر چکے تھے لیکن ان کے قاتل ابھی تک دندناتے پھرتے تھے۔ حضرات طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما اور ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے طے کیا کہ بصرہ چل کر قاتلین عثمان کو ڈھونڈنا اور ان سے انتقام لینا چاہیے۔ ادھر حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے مرکز خلافت کوفہ منتقل کرنے کا ارادہ کر لیا تھا اور وہ روانہ ہونے والے تھے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے ان کے اس اقدام کی بھی مخالفت کی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خیال تھا کہ ان کے خیر خواہ کوفہ و بصرہ میں ہیں،

[1] تاریخ الطبري:5/368. [2] سير أعلام النبلاء:3/224. [3] تاريخ الطبري:5/466.

اس لیے انھیں وہیں جا کر تمام معاملات نمٹانے چاہئیں۔ [11]

اسی اثنا میں انھیں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرات طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کی بصرہ روانگی کی اطلاع ملی، چنانچہ انھوں نے پہلے بصرہ جانے اور ان محترم حضرات سے معاملات طے کرنے کا منصوبہ بنایا۔ صحابۂ کرام میں بڑی تعداد ایسے افراد کی بھی تھی جنھیں ان تمام معاملات سے کچھ سروکار نہیں تھا۔ فتنوں سے دامن بچا کر اپنے اپنے گھروں میں بیٹھ گئے تھے۔ ان میں حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت ابوموسیٰ اشعری، حضرت اسامہ بن زید، حضرت محمد بن مسلمہ، حضرت سلمہ بن اکوع، حضرت عمران بن حصین، حضرت سعید بن عاص، حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص، حضرت صہیب بن سنان رومی، حضرت ابوایوب انصاری، حضرت ابوہریرہ اور حضرت عبداللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہم نمایاں طور پر شامل تھے۔

معاملات نہایت مشتبہ تھے۔ یوں ہر کوئی اپنے اپنے اجتہاد پر کاربند تھا۔ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرات طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کے لشکروں نے بصرہ پہنچ کر قاتلین عثمان کے ایک سرغنہ حکیم بن جبلہ اور اس کے ساتھیوں کو قتل کر ڈالا تھا۔ ادھر حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اپنے لشکر سمیت بصرہ پہنچ چکے تھے۔ فریقین اس امر پر متفق تھے کہ قاتلین عثمان سے انتقام لینا چاہیے تاہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خیال تھا کہ حالات ذرا قابو میں آئیں تو یہ کام کیا جائے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرات طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کے خیال میں یہ کام اولین فرصت میں کرنا چاہیے تھا اور خلیفہ اگر اس پر قادر نہیں تھا تو وہ خود یہ کام کر رہے تھے۔ حضرت قعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہ اِس کوشش میں مصروف تھے کہ فریقین میں صلح ہو جائے۔ اُن کی کوشش بارآور ثابت ہوئی تھی اور فریقین صلح پر راضی تھے کہ سبائیوں نے

[11] الثقات لابن حبان: 2/284.

جنگ کی آگ بھڑکا دی، جس کے نتیجے میں جنگ جمل کا افسوسناک سانحہ پیش آیا۔ حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ سمیت بیس ہزار مسلمان اس جنگ کی بھینٹ چڑھ گئے۔ جنگ کے اختتام پر تمام اہل بصرہ نے حضرت علی ابن ابی طالب کی بیعت کر لی اور ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا مدینہ واپس تشریف لے آئیں۔

اب حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اہل شام کی طرف متوجہ ہوئے اور حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کو ان کے ہاں روانہ کیا۔ انھوں نے آکر بتایا کہ اہل شام کہتے ہیں پہلے عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتل ہمارے حوالے کیجیے، پھر ہم آپ کی بیعت کریں گے۔ یہ سن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پیش قدمی کی۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اس مرتبہ بھی والد کی مخالفت کی کہ آپ کو اہل شام سے لڑائی نہیں کرنی چاہیے۔ بہت سے مسلمانوں کا خون بہہ جائے گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کا مشورہ نہیں مانا اور پیش قدمی کر کے صفین میں جا پڑاؤ کیا۔ [1]

حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما قاتلین عثمان سے انتقام لینے کے سلسلے میں نہایت سنجیدہ، پرعزم اور غایت درجہ مخلص تھے۔ انھوں نے اپنے طور پر مصر میں دندناتے پھرتے ان فتنہ پردازوں کو چن چن کر موت کے گھاٹ اتارا تھا جنھوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر دھاوا بولنے کی منصوبہ بندی کی تھی۔ انھیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پیش قدمی کا پتہ چلا تو انھوں نے شام کے عمائدین سے مشاورت کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ قاتلین عثمان (رضی اللہ عنہ) کی حوالگی یا پھر جنگ۔

چنانچہ صفین میں خونریز لڑائی ہوئی، جس کے نتیجے میں ستر ہزار مسلمان مارے گئے۔ لڑائی کے تیسرے روز فریقین کی طرف سے جنگ بندی کی آوازیں اٹھیں۔ یہ طے پایا کہ فریقین کی طرف سے ایک ایک آدمی ثالثی کا کردار ادا کرے گا۔ وہ جو فیصلہ کرے گا

[1] البداية والنهاية:240/7.

اسی پر عمل کیا جائے گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنا ثالث (حکم) حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو بنایا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کا نام پیش کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں موجود قاتلین عثمان ان کے اس فیصلے پر بگڑ گئے۔ وہ تو یہ چاہتے تھے کہ یونہی جنگ جاری رہے۔ فریقین کی قوت ضائع ہو اور وہ ان سے بدلہ لینے کے لیے ایکا نہ کر پائیں۔ جب انھوں نے دیکھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی صلح پر راضی ہیں تو وہ ان کے خلاف ہو گئے اور لشکر سے علیحدگی اختیار کر لی۔ انھی افراد نے بعد ازاں خوارج کا روپ دھارا۔ 17 صفر 37 ھ کو فریقین میں معاہدۂ صلح تحریر کیا گیا۔ بعد ازاں حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ اپنے لشکر کے ہمراہ شام واپس چلے گئے۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نہروان میں خوارج کے خلاف نبرد آزما ہو گئے۔ بعد ازاں خوارج نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اپنے تین سورما انھوں نے اس مہم کے لیے تیار کیے۔ ان تینوں نے ایک ہی دن فجر کے وقت شام اور کوفہ میں ان تینوں پر حملہ کیا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر حملہ آور کا وار اوچھا پڑا اور وہ معمولی زخمی ہوئے۔ حملہ آور کو فوراً گرفتار کر لیا گیا۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اس روز بیمار تھے۔ گھر سے ہی نہیں نکلے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر حملہ کرنے والے کا نام ابن ملجم تھا۔ اس کے وار کاری ثابت ہوئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ زخمی ہو کر بعد ازاں جام شہادت نوش کر گئے۔ [1]

یہ 21 رمضان المبارک 40 ھ کی صبح کا واقعہ ہے۔ [2]

---

[1] تاریخ الطبري:1489/5. [2] التاریخ الکبیر للبخاري:99/1.

رجالِ قرآن

وہ مردانِ حق جن کے بارے میں قرآن کریم نازل ہوا



آج کے اس پرفتن دور میں جبکہ نوجوان نسل بتدریج اسلام سے دور ہورہی ہے، اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ہم اپنے نوجوانوں کو اپنے اسلاف کی سیرت پڑھائیں، نوجوان نسل کو بتائیں کہ ان کے اخلاق وکردار کیسے تھے اور انھوں نے اسلام کے لیے کتنی قربانیاں پیش کیں۔

''رجالِ قرآن'' کے فاضل مؤلف ڈاکٹر عبدالرحمٰن عمیرہ کا اسلوب بیان بڑا عمدہ ہے۔انھوں نے بالکل کہانی کے انداز میں ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سیرت اس کتاب میں بیان کی ہے جن کے بارے میں قرآن کریم میں آیات نازل ہوئی ہیں۔ انھوں نے اس کتاب میں صحابہ کرام ہی نہیں بلکہ ان کفار اور منافقین کے بارے میں بھی پوری تفصیل کے ساتھ لکھا ہے جن کے بارے میں قرآن نازل ہوا، کتاب میں موجود واقعات تاریخ کی مستند کتابوں سے نقل کیے گئے ہیں۔ ان واقعات اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مبارک زندگیوں میں ہمارے لیے دروس ہیں۔

دارُالسّلام
کتاب وسنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ
DARUSSALAM
9786035002646